

اہم مباحث

اسلام

جمہوریت اور آئین پاکستان

تدوین: سجاد اظہر

پاک انسٹیٹیوٹ فار پیس سٹڈیز



اہم مباحث

اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان

تدوین

سجاد اظہر



جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	:	اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان
مدونہ	:	سجادا ظہر
اشاعت	:	2014
تزمین	:	زی گرافس
قیمت	:	100 روپے
تعداد	:	ایک ہزار
صفحات	:	144
مطبع	:	بی پی انج پرنٹرز

ISBN: 978-969-9370-20-5



پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد

فون: 051-2806074:

ایمیل: info@narratives.pk

ویب سائٹ: narratives.pk

فهرست

۵	تعارف
۹	مکالمہ اول
۵۵	مکالمہ دوم
۹۳	مکالمہ سوم
۱۲۱	مکالمہ چہارم (قوى)
۱۳۱	متفقہ سفارشات

تعارف

پاک نسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) گزشتہ چار سال سے پاکستان کو درپیش مختلف النوع مسائل کے حل کے لئے علمائے کرام کے ساتھ مشاورت میں سرگرم عمل ہے۔ اس ضمن میں ادارہ بین المسالک اور بین المذاہب مکالمہ کی علاوہ علمائے کرام کے دیگر طبقات کے ساتھ مکالمہ اور روابط کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ دینی مدارس کے طلباء کی حوصلہ افزائی کے لئے مختلف تقریبات کا انعقاد، مدارس اور دیگر جامعات کے طلباء کے درمیان روابط اور مکالمہ کا فروغ بھی ادارہ کی ترجیحات میں شامل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے موضوعات جن کا برآوراست تعلق علمائے کرام اور مذہبی سکالرز کے ساتھ ہے یا جن موضوعات میں عوام رہنمائی کے لئے علمائے کرام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ان پر مختلف مسالک کے جید علمائے کرام کے مابین مکالمہ اور مباحثت کے ذریعے ایک متفقہ فکر و نظریہ کا فروغ بھی ہماری کاؤشوں میں شامل ہے تاکہ علمائے کرام عوام الناس کی مہم اور پیچیدہ مسائل میں بہترین رہنمائی کر سکیں۔ پاک نسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) کی علمائے کرام کے ساتھ مختلف سرگرمیوں میں بالخصوص مسئلہ تکفیر و خروج کی بحث میں یہ بات سامنے آئی کہ علمائے کرام اور مذہبی سکالرز آئیں پاکستان اور جمہوریت کے

بارے میں متذبذب اور منفرج خیالات اور نظریات رکھتے ہیں۔

:- جمہوریت اگرچہ کفر بواح نہیں ہے لیکن یہ اسلام اور شریعت کے نفاذ کے لئے کوئی مثالی سیاسی نظام بھی نہیں کیونکہ یہ نظام بہت سی حدود و قیود اور بنیان القوامی قوانین کا پابند ہے۔

:- جمہوریت ایسے قوانین اور فیصلوں کو نافذ اعمال کرتی ہے جو عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل قانون ساز ادارہ بناتا ہے، یہ اس بات کے متزلف ہے کہ حکمران خدا کے علاوہ کسی اور کا بھی حکم مان سکتا ہے یا وہ حکم جاری کر سکتا ہے جو اس کی مشا ہو۔

:- اگرچہ دین اسلام لوگوں کے منتخب نمائندوں کی تکمیل اور خود مختاری کو مسترد کرتا ہے لیکن یہ لوگوں کو حق حکمرانی دیتا ہے اور انہیں یہ اختیار فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے حکمران منتخب کریں۔

:- علامہ محمد اقبال پارلیمنٹ کو ہم عصر زمانے میں اجماع (مسلمان اہل علم کا کسی قانون یا مسئلہ پر متفقہ رائے قائم کرنا) کے متزلف خیال کرتے ہیں۔ یعنی اگر مسلمان اپنی پارلیمنٹ کو اسلام کی تشریع کا اور شریعت کے مطابق قانون سازی کا حق دے دیں تو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین اور تشریع کو غیر اسلامی قرار نہیں دیا جائے گا۔

:- علامے کرام اور مذہبی سکالرز کو اسلام اور جمہوریت کے لئے اپنے اکابرین علماء کے مرتب کر دہ 22 آئینی نکات سے اخراج نہیں کرنا چاہئے، جس میں انہوں نے جدید سیاسی نظام اور اس کے مختلف عناصر مثلاً ریاست، پارلیمنٹ، آئین اور قانون سازی کو 1973ء کے آئین کے تحت تسلیم کیا ہے۔

جمہوریت اور آئین پاکستان کی حیثیت کے بارے میں پائے جانے والے علماء کرام کے متفاہ اور متذبذب افکار و نظریات ملک کے مذہبی بیانیے کے ذریعے اور اسی طرح کے دیگر مذہبی و نظریاتی ابہامات سرعت کے ساتھ پھیلتے جا رہے ہیں جو ملک میں جمہوری طریقہ کار پروگرام کو مزید شک و شبہات میں بٹلا کرتے ہیں بالخصوص ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے

طریقہ کارا در لائچے عمل طے کرنے میں ایک اہم رکاوٹ ہیں۔

طالبان کے ایک اہم رہنماء عمر خالد خراسانی نے جماعت اسلامی کے منتخب امیر سراج الحق کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ پاکستان میں جمہوری جدوجہد کے ذریعے پچھلے 66 سال سے شریعت نافذ نہیں ہو سکتی لہذا اب اس کے لئے مسلح جدوجہد کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ (بحوالہ ماہنامہ البر بان لاہور شمارہ اپریل 2014)

اس کی بھی علماء وضاحت کریں کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد اگرچوئی کا عمل ہے تو اصلاح معاشرہ کی کوششوں کا درجہ کیا ہوگا اور قتال کا کیا، مولا نا اشرف علی تھانوی نے کہا تھا کہ اگر مجھے حکومت مل جائے تو (حدود وغیرہ نافذ کرنے سے پہلے) دس سال تک لوگوں کی اصلاح کروں گا۔

ایک اور نقطہ نظر جس کی وضاحت کرتے ہوئے ماہنامہ الشریعہ کو جرانوالہ (شمارہ جون 2014) نے لکھا ہے کہ انسانیت کی تاریخ میں جنگ و قتال بجا طور پر ہمیشہ ایک غیر مطلوب، اضطراری اور ہنگامی حالت رہی ہے اور امن و سکون کا زمانہ بالکل فطری، مطلوب اور مستقل چیز سمجھا جاتا رہا ہے، کسی بھی قسم کی تبدیلی کی جدوجہد کے لئے بھی یہ اصول فطری اور

عین مطلوب ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ مولا نا مودودی کا ایک اقتباس پیش کیا گیا ہے جس میں مولا نا فرماتے ہیں کہ ”غالطی سے تاریخ نگاروں نے غزوتوں کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا حالانکہ آٹھ سال کی تمام لڑائیوں میں جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مختصر ہوئی، طرفین کے جانی نقصان کی تعداد بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلاب کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب کہے جانے کا مستحق ہے۔“

اس پس منظر میں پاک انسٹی ٹیوٹ فارمیں سٹڈیز نے علمائے کرام کو رہنمائی کے لئے مدعو کیا تاکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک واضح نقطہ نظر پیش کریں۔

اس سلسلے میں کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں مباحثت کے چار ادوار ہوئے۔ یہ کتاب

انہی مباحث اور مکالموں پر مشتمل ہے۔ پاک انسٹی ٹیوٹ فارمیس سٹڈیز تمام علمائے کرام اور طلباء کی بھرپور شرکت پر مشکور ہے اور تو قع ہے کہ ان کی یہ گفتگو اس موضوع پر چھائی دھنڈ کو صاف کرنے میں مددے گی اور آئندہ مباحثت کے لئے اہم بنیاد فراہم کرے گی۔ اس کتاب کی ترتیب اور تدوین میں برادرم سجاد اظہر نے جس تن دہی اور محنت سے کام کیا ادارہ اس پر سپاس گزار ہے۔

محمد عامر رانا

ڈائریکٹر

پاک انسٹی ٹیوٹ فارمیس سٹڈیز اسلام آباد

2014 نومبر 16

مکالمہ اول

مقام: کراچی

تاریخ: 17 مئی 2014

میزبان: محمد عامر رانا، ڈائریکٹر پاک انٹریٹیو ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

صدارت: مفتی نبی الرحمن، چیئرمین مرکزی روہت ہلال کمیٹی و صدر تنظیم المدارس پاکستان

شرکاء گفتگو:

مولانا محمد سلفی، پرنسپل جامعہ ستاریہ کراچی

پروفیسر ڈاکٹر علی اونج، ڈین فیکٹلی آف اسلامک سٹڈیز، جامعہ کراچی

پروفیسر سید شاہد ہاشمی، ڈائریکٹر اسلامک ریسرچ اکیڈمی

علامہ اکبر حسین زاہدی، وائس پرنسپل جامعہ الصادق کوئٹہ

مولانا سیف اللہ رباني، مدرس جامعہ بنوریہ عالیہ و فاقہ المساجد پاکستان

مولانا محمد شفیع چترالی، ندوی سکالر و کالم نگار روزنامہ اسلام

مولانا عبدالحق ہاشمی، مرکزی رہنمای جماعت اسلامی بلوچستان و مشیرو فاقی شرعی عدالت

ڈاکٹر اعجاز صمدانی، پروفیسر و مفتی جامعہ دارالعلوم کراچی

علامہ عبدالخالق آفریدی، ڈائریکٹر جزوی شبان الغرباء اہل حدیث

پروفیسر مرزا عمر بیگ، ڈائریکٹر الصفہ اکیڈمی کراچی

مولانا سید احمد بنوری، مدرس جامعہ اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

مولانا اعجاز حیدر مظہری، ریسرچ سکالر انژر ہرہ اکیڈمی

مولانا کاشف شخش، پرنسپل مدرسہ الانصار کراچی

کراچی میں منعقدہ مباحثے کے شرکاء



محمد عامر رانا، میزبان

ڈاکٹر کیثر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

آج کے مکالمے کا مقصد یہ ہے کہ معزز علمائے کرام کی رائے معلوم کریں کہ پاکستان میں آئین اور جمہوریت کے حوالے سے جو بحث چل رہی ہے اس پر ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔

صدراتی کلمات

مفہومیں ارجمند

چیئرمین مرکزی روپسٹ ہلال کمیٹی و صدر تنظیم المدارس پاکستان

جمهوریت کے لئے اگریز میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں Republic اور Democracy، میں ایک مرتبہ امریکہ ایک مکالمے شریک ہوا تو ان کے صدراتی امیدوار سنیٹر گیری ہارت جن پر کسی معاشرتے کا الزام لگا اور وہ مقابلے سے ساقط ہو گئے تھے، انہوں نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا تعارف وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ریپبلک تو یہ ہے کہ ہر فرد خود بولے، ہر ایک کی رائے آئے یہ کسی سو پانچ سو کے گروہ میں تو ہو سکتی ہے لیکن کروڑوں کی آبادی پر مشتمل کسی ملک یا خطے میں نہیں ہو سکتی، انہوں نے کہا ڈیموکریسی کا مطلب یہ ہے کہ عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے بولیں جس طرح امریکہ میں کانگریس ہے، ہمارے ہاں پارلیمنٹ ہے۔ میرے نزدیک لفظ جمہوریہ کی رو سے خالصتاً کاملاً جمہور تیں ممکن نہیں ہیں۔ کیونکہ جو بات تجربات سے ہمارے سامنے ہے کہ اگر کسی ملک میں دس کروڑ ووٹ ہیں تو زیادہ سے زیادہ کائنٹ ووٹ چھ کروڑ ہوں گے۔ کہیں اتفاقاً سات، آٹھ کروڑ بھی پڑ سکتے ہیں، اور اگر آٹھ دس امیدوار تھے تو یہ ووٹ ان میں تقسیم ہو گیا، فرض کریں کہ کسی نے اتفاقاً 25 نیصد ووٹ لئے اور وہ جیت بھی گیا تو اس کو نمائندہ تو سو میں سے 25 نے بنایا۔ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سو فیصد کا نمائندہ ہے تو عملًا اس کے پیچھے سو فیصد کی مرضی یا رائے شامل نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اس جدید جمہوریت میں جسے ہم برتر ہے ہیں سو فیصد کی تقدیر کا مالک ہو جاتا ہے۔ اس لئے میری رائے میں حقیقی اور خالصتاً جمہوریت کا مظہر آج تک روئے زمین پر نہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ جمہوریت کے ذریعے

اسلام آسکتا ہے یا نہیں؟ جمہوریت اپنی جبلت، فطرت اور ساخت کے اعتبار سے سیکولر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہور جو بولیں گے جب وہ حق قرار پائے گا، ایسی جمہوریت میں جس نے دس قتل کے ہوئے ہوں اور وہ رجڑ ڈوٹر ہونخواہ وہ جیل میں بھی ہو، تو اس کے ووٹ کی قیمت اور ہمارے ڈین ڈاکٹر شکیل اونچ صاحب کے ووٹ کی قیمت ایک ہے، مطلقاً اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر معاشرے میں خیر غالباً ہوتا شاید مجموعی نتیجہ خیر کی صورت میں آجائے اور اگر شر غالباً ہوتا شر بھی قانون بن جائے گا۔ اس کو پاکستان کے تناظر میں دیکھیں تو پاکستان میں خیر کو غلبہ کا ملمہ واکثر یہ نصیب نہیں ہوا۔ مجھے تو بھی دور دور تک امکان بھی نظر نہیں آتا۔ ایسی جمہوریہ جس میں ہمارے صدر پرویز مشرف نے سماٹھ عورتیں بھی زبردستی ڈال دی ہوں اور یہ اللہ والے سارے اس پارلیمنٹ میں موجود تھے۔ اب ان سماٹھ بیگمات کو جو بیوی پارلر سے ہو کر آتی ہیں ان کو تو آپ پارلیمنٹ سے نکال نہیں سکتے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ غیر مسلم ووٹروں کی لست الگ ہوتا کہ وہ اپنے نمائندے اپنی مرضی سے بنا کیں خود غیر مسلموں نے کہا کہ اس سے تو ہم دوسرا درجے کے شہری ہو گئے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے نمائندے نے مجھے یہ کہا۔ میں نے جواب دیا آپ بعد میں کہتے ہیں کہ ہمیں ریزو سٹیشن دو انھوں نے کہا کہ ہم نہیں مطالبة کرتے اس کے بعد جدا گانہ انتخاب ختم ہوا اور مشترک انتخاب لایا گیا۔ مشرف نے پھر اقلیتوں کے لئے سٹیشن رکھ دیں۔ لہذا اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک چیز کے اسلامی یا شرعی ہونے کے بارے میں بحث ہو رہی ہو اور فرض کریں کہ ہماری اس وقت کی اسمبلی 342 اراکین پر مشتمل ہے اور 172 سادہ اکثریت بنی ہے۔ اگر ایک جانب مسلمان جو اسلام کو لانا چاہتے ہیں ان کے پاس 160 ووٹ ہیں اور اگر 20 غیر مسلم دوسری طرف ہو جاتے ہیں تو وہ جو فیصلہ کریں گے وہ اسلام قرار پائے گا۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ کیماں اسلام ہے جس کا فیصلہ ان لوگوں نے اپنی اکثریت کی بنیاد پر کرنا ہے؟ لہذا کسی حد تک ہمارا کمین اپنے روایتی عہد کے اعتبار سے ٹھوڑا بہت اسلامی ہے کہ اس کے سہارے سے کوئی پریش ڈالا کر کچھ امکانات پیدا کئے جاسکتے ہیں ورنہ حقیقت میں اس آئین میں اور نظام کے ذریعے اسلام کا غالباً آنا عملاء بہت مشکل ہے۔ قوی اسمبلی میں ہماری سٹیشن 217 تھیں لیکن جب جاگیرداروں کی اپنی سٹیشن کم ہونا شروع ہو کیں تو انھوں نے سوچا کہ سٹیشن بھی پھیلا دوتا کہ جاگیر کے اندر ہماری سیٹ

نکتی رہے۔ جبکہ انڈیا جو کہ 120 کروڑ کی آبادی ہے، اُس کی 545 سیٹیں ہیں۔ ہندوستان بننے کے بعد سے جتنی تھیں آج تک وہی ہیں، اس کی آبادی ہم سے چھگنا ہے۔ ہم اسلام کے ساتھ بھی اور جمہوریت کے ساتھ بھی ڈرامہ کرتے ہیں۔ اس لئے ہماری ساری بحثیں نظری ہوتی ہیں ان کے حقیقی اثرات مرتب نہیں ہوتے لیکن آپ صاحبان علم ہیں امید ہے کہ آپ کی کوشش سے پرداہ غیب سے کوئی امید کی کوئی کرن نظر آجائے جس سے ہم استفادہ کر لیں۔

محمد عامر رانا، میزبان

ڈاکٹر یکش پاک انسٹی ٹیوٹ فارمیشن سٹڈیز

مفتش صاحب آپ نے بہت اہم نکات کی طرف اشارہ کیا۔ ان ایشورز پر اور جمہوری نظام کی خامیوں پر مغرب کے مشہور دانشور بھی اشارہ کرتے ہیں کہ جمہوریت کوئی مثالی نظام نہیں ہے لیکن ابھی تک اس سے بہتر نظام یا اس کا مقابل بھی موجود نہیں ہے۔ یہ ایک رائے ہے اس پر بھی بات ہو سکتی ہے۔ جو اعتراضات مفتش صاحب نے یہاں پر اٹھائے اس سے بھی زیادہ شدید وہاں اٹھائے جاتے رہے ہیں اور صدیوں سے یہ بحث جاری ہے۔ عالم اسلام کے چند ممالک میں کچھ پیش رفت ہو رہی ہے۔ ہم تیونس کی مثال دیکھ سکتے ہیں کہ وہاں پر ابھی آئین سازی کا عمل مکمل ہوا ہے کہ وہ کس طریقے سے ہوا اور معاشرے کے مختلف طبقات نے مل کر اس کو کیسے پایا تینکیل تک پہنچایا۔ یمن کے اندر عرب سپر گگ کے بعد جو ایک قومی مکالہ چل رہا ہے جس میں علمائے کرام وہاں کے اکابرین، وہاں کے قبائلی سردار، وہاں کی سول سو سائی، مقتدر طبقات سب مل کر مسلسل ایک سال سے کوشش میں ہیں کہ ایک متفقہ آئین، ایک ایسا چارٹر بنانے میں کامیاب ہو جائیں جس کی رہنمائی میں وہ ادارہ سازی کا کام کر سکیں۔ اور یقیناً یمن کے اندر ویسے ہی سوالات اٹھ رہے ہیں جو ہم نے یہاں بھی اٹھائے ہیں، یہ تمام سوالات وہاں پر بھی زیر بحث آرہے ہیں۔

مولانا محمد سلفی

پرنسپل، جامعہ ستاریہ کراچی

دستور پاکستان کے ناطے ہم سب کو علم ہے کہ اس ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں بنے گا جو کتاب و سنت کے منافی ہو۔ اگر کوئی ایسا قانون بن بھی گیا تو وہ کالعدم ہو جائے گا اس لئے کہ دستور میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ یہاں کا اقتدار علیٰ ذات باری تعالیٰ ہے۔ یہ ایک بہت بڑی کڑھارس ہے نہ صرف اہل پاکستان کے لئے بلکہ سارے جہاں کے مسلمانوں کے لئے بھی کہ پاکستان کے قانون میں اس بات کو تحریری طور پر پاس کرایا گیا کہ اس ملک کا دستور کتاب و سنت کے مطابق ہوگا۔ یہ بات الگ ہے کہ ہمارے قوانین میں لکھا ہوا ہے کہ ہر شہری کو بنیادی سہولیات میسر ہوں گی، 16 سال سے کم عمر بچوں سے مزدوری نہیں لی جائے گی، ہر شہری کو ستان انصاف میسر ہو گا، لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے کام کیا جائے گا، روتی، کپڑا مکان ریاست کی ذمہ داری ہو گی۔ آرٹیکل 63 کے تحت جس نے قرض لیا ہو یا نادہنده ہو اور یہ کس ادا نہ کرتا ہو وہ پالیment کا ممبر نہیں بن سکتا۔ تفصیل میں جانے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ دیگ سے ایک چاول نکال کر پتہ لگ جاتا ہے کہ دیگ کپکی ہے یا نہیں، بالکل اس طرح ہمارے ملک میں دستور پاکستان کے نام سے جو کتابچہ موجود ہے اس میں بہت ساری اچھائیاں ہیں کچھ خامیاں بھی ہو سکتی ہیں سوال یہ کہ اس پر عمل کس حد تک کیا جاتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شکیل اونج

ڈین فیکٹی آف اسلامک سٹڈیز جامعہ کراچی

ہمارے آئین میں یہ بات درج ہے کہ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بن سکتا۔ یہ ایک بڑی کامیابی ہے اتنا بڑا آپشن عوام کو دے دیا گیا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اس آئین کے تحت بننے والے قوانین جن کو ہم قانون موضوعہ کہتے ہیں وہ قانون قرآن و سنت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اور اگر نہیں ہیں تو کتنے لوگوں نے ان کو اب تک عدالتوں میں چلیخ کیا ہے۔ اگر اس چلیخ کو کوئی قبول نہیں کر رہا اور صرف آئین کو بر اجلا کہہ رہا ہے تو قصور جمہوریت کا نہیں بلکہ عوام کا ہے۔

جمهوریت کو ہم دو اعتبار سے تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ جس کے ڈانٹے اسلام سے مل جائیں گے اور دوسرا مغربی طرز کی ہے۔ مغربی جمہوریت کے تحت 51 گدھے 49 گھوڑوں کے حکمران بن سکتے ہیں۔ یہ نظام الہیت اور نظام صالحیت کے بھی خلاف ہے۔ میرا مطمئن نظر یہ ہے کہ جو بھی حکومت اللہ کی مرضی سے قائم ہوتی ہے وہ مطلوب بھی ہے اور صحیح بھی، اور جو انسانوں کی مرضی سے قائم ہوتی ہے وہ حکومت سیکولر ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کریم جو مسلمانوں کی زندگی کی ایک بنیادی کتاب ہے جس سے مسلمان کا تعلق اتنا بنیادی ہے کہ اگر کسی لمحے وہ بے تعلق ہو جائے تو شاید اس کا اسلام انتقال کر جائے۔ مگر الیہ یہ ہے کہ اس کتاب سے مسلمانوں کا تعلق ختم ہو چکا ہے، مردم شماری ہوتے ہے شمارا اور اگر مردم شناسی ہوتے تو چار۔ قرآن کریم کو جانے والے لوگ اب براءے نام رہ گئے ہیں۔ جو علم قرآن سے حاصل ہوتا ہے اس علم سے حکومت فیصلہ کرتی ہے۔ کتاب اللہ کا وارث ان تمام لوگوں کو بنایا گیا ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے بعد تھیو کریمی کے تصور کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی قرآن کے مطابق آئین سازی کی بات کرے اور لوگ اس کو ملائیت سے تعییر کر کے زندگی سے عملًا نکال کر پھینکنے کی بات کریں تو یہ قابل افسوس بات ہی ہو گی۔ باقی جس تعییر کا تعلق قرآن سے نہ ہو انسانی فہم سے ہو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ اسلام میں تو یہ ہے کہ سیدنا فاروق اعظم جیسا خلیفہ وقت جب وہ یہ قانون نافذ کرنا چاہتا ہے کہ اب مہر کی کم سے کم مقدار اتنی ہونی چاہئے تو ایک خاتون کھڑی ہو کر کہتی ہیں کہ آپ کون ہوتے ہیں اس کا تعین کرنے والے؟ اللہ نے جب ہمیں اجازت دی ہے تو آپ کون ہوتے ہیں روکنے والے، جس پر خلیفہ وقت فوراً سرمنڈر ہو جاتا ہے۔ اب اگر ہمارے حکمرانوں کے سامنے قرآن کی دلیل استعمال کی جائے تو کیا وہ سرمنڈر ہو جائے گا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہمارے عالم کو بھی اگر کوئی دوسرا رائے دے جائے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنی رائے سے ہٹ جائے۔ وہ اپنا وکیل بن جائے گا کمزور سے کمزور دلائل لائے گا۔ چاروں طرف سے اپنے جماعتی اکٹھے کر لے گا۔ جو کام عالم کر رہا ہے وہی حکمران کر رہا ہے۔ دونوں کے دونوں سیاست کر رہے ہیں۔ اصل دین اسلام تو قرآن کریم کے اندر ہے وہاں سے کشید کر کے جب آپ اپنے قوانین پر لگو کریں گے تو ایک مختلف قسم کا معاشرہ اور انسان وجود میں آئے گا۔ اسلام انکو پسند نہیں کرتا وہ ایک

نظم قائم کرنا چاہتا ہے نظم قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ جب اس نظام کو چلانے والا ٹھیک ہوتا ہے تو اس کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اس کی کوئی نسل بھی ”اوی الامر“ میں آتی ہے۔ قرآن کریم نے ہم کو ”اوی الامر“ کا پابند کر دیا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اگر تمہارا تنازع ”اوی الامر“ سے ہو جائے تو تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹ کر آ جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو اختلاف ہوا وہ ہوا ہی ”اوی الامر“ سے، ”اوی الامر“ غیر نبی کے سوا جو بھی ہو گا وہ ”اوی الامر“ میں ہی آئے گا حتیٰ کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ جیسا غایفہ، جب پہلی بار حکومت نبی سے غیر نبی میں منتقل ہوئی تو وہ مسلمانوں کے ”اوی الامر“ بنے۔ قرآن کریم کی رو سے اس بھی اختلاف ممکن تھا اور لوگوں نے اختلاف کیا بھی۔ اختلاف کرنے والے غیر مسلم نہیں ہو گئے۔ اسلامی قانون کے اندر قانون بدل نہیں سکتا۔ لیکن جمہوریت میں اکثریت سے قوانین بدل جاتے ہیں فیصلے میرٹ کی بنیاد پر ہونے چاہئیں نہ کہ کثرتِ رائے کی بناء پر۔

مولانا محمد شفیع چترالی

ندیہی سکالروکالم نگار روز نامہ اسلام

جب بات مغربی طرزِ حکومت کی ہوتی ہے تو جمہوریت کو ایک مسلمہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام کو جمہوریت کی عدالت میں پیش کر دیا جاتا ہے یعنی جمہوریت عالمی سطح پر تسلیم شدہ ہے اب اسلام اس کے مطابق چل سکتا ہے یا نہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نظامِ حیات ہے۔ جمہوریت کو زیادہ ہم نظام حکومت کہہ سکتے ہیں۔ جمہوریت کا جو سب سے بڑا فائدہ سامنے آیا ہے جس کی وجہ سے دنیا اس کو قبول کرتی ہے وہ پر امن انتقال اقتدار ہے۔ لیکن یہ نظام حکومت ہے نظامِ حیات نہیں۔ اجتماعی زندگی کی اخلاقیات پر جمہوریت کے پاس کوئی رہنمائی نہیں، جمہوریت بذاتِ خود کوئی دلیل نہیں ہے ایک بات دلوگ کر رہے ہیں اور ایک بات ایک بندہ کر رہا ہے اس لئے دو بندوں کی بات تسلیم کر لی جائے۔ یہ بات علمی لحاظ سے درست معلوم نہیں ہوتی۔ سفر اٹکو زہر کا پیالہ اسی لئے پینا پڑا تھا کہ ان سے کہا گیا کہ جمہور غلط نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ اور سارے طبقات ایک بات کر رہے ہیں اور تم اس کے خلاف بات کرتے ہو۔ یہ گویا کہ

جمهوریت ہے، جمہوریت خیر اور شر کے معیارات متعین نہیں کر سکتی۔ کیا چیز صحیح ہے کیا غلط، کیا پاک ہے کیا ناپاک، کیا حلال ہے کیا احرام، ان معیارات کا تعین کرنا جمہوریت کے بس میں نہیں اس لئے میرے خیال میں جمہوریت ایک جزو ہے اور اسلام ایک کل ہے۔ کچھ چیزوں میں اسلام اور جمہوریت کے درمیان مادہ اجتماع پایا جاتا ہے مثال کے طور پر اگر جمہوریت اجتماعی داش سے فیصلے کرنے کا نام ہے تو یہ اسلام کے لئے کوئی نئی بات نہیں، قرآن نے دولفطون میں کہہ دیا کہ مسلمانوں کے معاملات ان کی اجتماعی داش سے طے ہوں گے۔ اب اس معاملے میں مادہ افتراق کیا ہے۔ جمہوریت اجتماعی داش اور اجتماعی خواہش میں فرق نہیں کرتی ایک مجموعہ ایک خواہش کا اظہار کر رہا ہے تو وہ قانون بن جاتا ہے جبکہ اسلام کہتا ہے کہ اجتماعی خواہش کوئی دلیل نہیں ہے۔ اجتماعی داش کو آپ دلیل بناسکتے ہیں۔ لہذا اجتماعی داش سے فیصلے کرنے کا نام اگر جمہوریت ہے تو اسلام کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جمہوریت اگر حریت فکر کا نام ہے تو یہ بھی ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ خود نبی کریمؐ کی سیرت میں ایک بات سامنے آتی ہے کہ ایک صحابی کو آپ مُشورہ دیتے ہیں کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہیں تو وہ اللہ کے نبی کے سامنے کھڑے ہو کر کہتی ہے کہ اگر یہ آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر لیکن اگر آپ کا مشورہ ہے تو میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اتنا شعور اور اتنی حریت فکر جو اسلام میں دی گئی ہے۔ جمہوریت خواتین اور اقليتوں کے حقوق کا نام ہے تو اسلام نے یہ حقوق 14 سو سال پہلے متعین کر دیے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ پاکستان میں نظام حکومت کا سربراہ وزیر اعظم کہلاتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ پھر بادشاہ کون ہے۔ وزیر اعظم کا مطلب ہے کہ بڑا وزیر، وزیر یا بادشاہ کا ہوتا ہے پھر بادشاہ کون ہے؟ ویسے تو ہم نے آئین میں لکھا ہوا ہے کہ مقتدر عالیٰ، اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے لیکن دولتِ مشترکہ کے ممالک میں حکومت کا سربراہ وزیر اعظم کہلاتا ہے اور بادشاہت کی کرسی سلطنت برطانیہ کیلئے خالی رکھی گئی ہے۔ 1998 میں جب وہ بیہاں آئی تھیں تو ہمارے پیغمبر صاحب نے اس بات کا اظہار، عقیدت کے ساتھ کیا کہ ہم آج بھی آپ کے غلام ہیں۔ پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ 67 سال گزرنے کے باوجود ہم آج بھی برطانیہ کے غلام ہیں۔ برطانیہ کے زرعی قوانین جو وہاں کے سرد موسم سے

مطابقت رکھتے ہیں اگر ہم یہاں پاکستان میں وہی زرعی قوانین نافذ کریں گے تو کیا وہ چل سکتے ہیں۔ ب्रطانوی طرز کی جمہوریت کو یہاں مسلط کیا گیا اس فرق کے باوجود کہ وہاں پر ایک فرد کا ایک ووٹ ہے۔ اس بات سے قطعہ نظر کرتے ہوئے کہ وہاں پر بندہ آزاد ہے لیکن یہاں پر جا گیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں ایک مخصوص طبقہ آپ کے اوپر مسلط ہے۔ اس طبقے کے ہوتے ہوئے، مغربی جمہوریت یا ب्रطانوی نظام سے اسلام کی توقع رکھنا خام خیالی ہوگی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مقابل کیا ہے؟ میری رائے یہ ہے کہ اسلام کے پاس خلافت کا پورا ایک نظام موجود ہے۔ آج دنیا جغرافیائی اعتبار سے ممالک میں تقسیم ہو چکی ہے اگر خلافت قائم نہیں ہوتی تو ہمارے پاس بہتر راستہ صدارتی نظام ہو سکتا ہے جو شاید پارلیمانی نظام سے بہتر ہو۔ مصر کے اندر صدارتی نظام کے تحت ایک حکومت قائم ہوئی لیکن اس کو کس طریقے سے ناکام کیا گیا، جمہوریت کی ناکامی کی وجہ جہاں داخلی ہے وہاں عالمی طرزِ عمل بھی ہے۔ بر صغیر کے اندر 1915ء میں تحریکِ ریشمی رومال ناکام ہوئی اس کے بعد 1919ء میں جمعیت علمائے ہند بنی۔ اس سے پہلے بھی دینی طبقات نے جمہوریت کو قبول کیا ہوا تھا لیکن 1919ء کے بعد علماء کے طبقے نے بھی جمہوریت کو قبول کر لیا۔ انتخابات میں حصے لئے جا رہے ہیں اور جمہوریت کو چلا جا رہا ہے۔ آج سو سال گزرنے کے باوجود اس جمہوریت نے ہمیں کچھ نہیں دیا اس کی وجہ سے آج جو سوالات اٹھ رہے ہیں جو بغاوتیں اور سرکشیاں ہو رہی ہیں اس کی وجہ مایوسی ہے۔ میں نے اس کے داخلی اور خارجی اسباب بیان کئے۔ خارجی اسباب کیا ہیں؟ ہمیں یہ تاثر مل رہا ہے کہ اسلام کو جمہوریت سے مسئلہ ہے لیکن ہمارا تاثر یہ ہے کہ جمہوریت کو اسلام سے کوئی مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ مصر کے اندر غالب اکثریت کے ساتھ ایک جمہوری حکومت قائم ہو جاتی ہے اس میں پی ایچ ڈی اور اپنے اپنے شعبوں کے ماہرین پارلیمنٹ میں آتے ہیں اور صدر کا انتخاب کرتے ہیں لیکن ایک سال کے اندر اس کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ تیونس میں بھی ایک اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی لیکن اس کے خلاف کس طریقے سے محاذ بنا یا گیا۔ غزہ کے اندر حماس کی اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جاتا۔ خود آپ کے پاکستان کے اندر ایک صوبے میں جبکہ بل منظور ہوتا ہے تو اس کو قبول نہیں کیا جاتا۔ میرے خیال میں مسئلہ یہ نہیں کہ اسلام کو جمہوریت سے کوئی مسئلہ ہے آج مسئلہ یہ

ہے کہ جمہوریت، اسلام کو اپنے لئے ایک مسئلہ سمجھتی ہے۔

علامہ اکبر حسین زاہدی وائس پرنسپل جامعہ الصادق کوئٹہ

پاکستان 1947 میں معرض وجود میں آیا۔ یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ایک خطے کو دوسرے خطے سے جدا کرنا بہت آسان ہے لیکن اس خطے کو بغون ان ریاست کوئی اچھا آئین و قانون دینا سب سے مشکل کام ہے۔ ہماری یہ قسمتی تھی کہ 1948 میں جب قائد اعظم کا انتقال ہوا تو ان کے بعد وہ خطبات ہی متاز عز فرار پائے کہ قائد اعظم کس طرح کا پاکستان بنانا چاہتے تھے۔ کیا وہ مسلمانوں کے لئے ایک جدید ریاست کا قیام چاہتے تھے یا وہ اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ 1947 سے آج تک ہمارے علماء اور دانشور یہ طنہیں کر سکے کہ پاکستانی ریاست کا مطلب کیا تھا۔ کیا پاکستانی ریاست کا مطلب لا الہ الا اللہ تھا یا پاکستانی ریاست کا مطلب روئی کپڑا اور مکان تھا۔ اس مسئلے پر ہمارے مذہبی اور غیر مذہبی طبقات میں اختلاف ہی نہیں بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک طبقے کا یہ کہنا ہے کہ پاکستان لا الہ اللہ کے لئے وجود میں آیا جبکہ دوسرے طبقے کا کہنا ہے کہ پاکستان مسلمانوں کی فلاح و بہود کے لئے وجود میں لا یا گیا۔ جب تک یہ طنہیں ہو گا کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے۔ تضاد گہرے سے گہرا ہوتا چلا جائے گا۔ فقہ میں ایک چیز تدليسِ معاشرۃ کے نام سے ہے، یعنی ایک 70 سالہ خاتون یوٹی پارلی میں جاتی ہے، 18 سالہ لڑکی بن کر نکلتی ہے اور کسی کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے تو آیا اس کا نکاح درست ہے یا نہیں۔ ہماری مثال بھی یہی ہے بنیادی چیزوں کی جانب ہماری نظر بھی جاتی ہی نہیں ہے ہم بناؤ سکھار کو دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے اندر مسلمانوں کی آبادی 98 فیصد ہے۔ کوئی بھی مسلمان اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ یہاں حاکمیت اعلیٰ خداوند کریم کو حاصل ہے اس وقت لوگ اسلامی آئین و قانون سے بھی دور بھاگتے جا رہے ہیں۔ اور متفق ہو رہے ہیں اس کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ علماء کا پاکستان بنانے میں بڑا کردار تھا لیکن اس کے بعد آئین سازی میں انہوں نے کردار ادا نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے سیاستدانوں کی طرح ہمارے علماء بھی صرف اور صرف اقتدار کے پیچے چلے گئے تاکہ کسی

نہ کسی طرح اقتدار ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ آپ کو ہر سطح پر بدعنوں نظر آئے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم علماء نے اپنی ذمہ داری کا حق ادا نہیں کیا۔ اگر ہم ذمہ دار یوں کو ادا کرتے تو کم از کم معاشرے کو اچھے حکمران عطا کرتے۔ مثال کے طور پر مسجد کے اندر ہر طبقہ فکر آتا ہے ہماری وعظہ نصیحت بھی سنتا ہے اگر ہم صحیح وعظ کرتے تو ہمارے پیچھے نماز پڑھنے والے اتنا کرتے کہ ملاوٹ نہ کرتے جھوٹ نہ بولے کسی ایسے شخص کو ہمیں ووٹ نہیں دینا چاہئے جو شراب پیتا ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اس طرح کی چیزیں کیوں نہیں کہتے اور اگر کہتے ہیں تو پھر ہماری بالتوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ لہذا جمہوریت، آمریت اور بادشاہت دنیا کے مختلف ملکوں میں لاگو ہیں۔ آپ بادشاہت والے مالک میں سروے کر لیں وہاں لوگ خوش ملیں گے۔ جہاں پر آمریت ہے وہاں پر بھی اچھی نفعا پائی جاتی ہے۔ لیکن پاکستان میں کوئی نظام نہیں چل پارتا، جمہوریت کے نام پر بلوٹ مار جاری ہے۔ یقیناً آمریت کے مقابلے پر جمہوریت بہترین نظام ہے لیکن جمہوریت کو ہم کسی طور پر اسلام کے مقابلے ایک ضابطہ حیات قرار نہیں دے سکتے۔ ہمارے علماء کو دیکھنا چاہئے کہ ترجیحی بنیادوں پر کام کہاں سے شروع کریں۔

محمد عامر رانا، میزبان
ڈاکٹر یکش پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز
 ڈاکٹر ٹکلیل اونج صاحب! آپ نے ذکر کیا تھا کہ ایک پارٹی کا نظام نسبتاً بہتر ہو سکتا ہے لیکن اس حوالے سے جو اگلا سوال بتتا ہے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کا تصور اور اس میں عوام کی شرکت کیسے ہو سکتی ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر شکیل اونج
ڈین فیکٹی آف اسلامک سٹڈیز جامعہ کراچی
 میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہمارے ہاں پارٹی سمیم اقتدار کی رسہ شی کے گرد گھومتا ہے۔ اس طرح چوں کامربہ جب پارٹی میں آ کر بیٹھتا ہے اور ایک دوسرے کے لئے بیساکھی بن رہا ہوتا ہے تو پھر وہ ایک دوسرے کے مفادات کا خیال بھی کر رہا ہوتا ہے۔ اب کون سی اہلیت اور

کون سا اسلام۔ قرآن کریم نے ہمیں ایک اصول دے دیا کہ اگر ہمارے ہاں کسی سے معاونت ہو گی تو اس کی ایک بنیاد ہوگی اور اگر کسی سے عدم تعاون ہوگا تو اس کی بھی ایک بنیاد ہوگی اس بنیاد پر پارٹیوں کو دیکھنا ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر نواز شریف ایک بات کہہ دے تو اس کی پارٹی کے تمام افراد اس کے وکیل بن جائیں گے یہی حال زرداری صاحب اور دوسرے افراد کی پارٹیوں کا ہے۔ میرٹ کا قتل تو پہلے دن سے ہی شروع ہو جاتا ہے ہم جب اسلام کی بات کر رہے ہوتے ہیں تو مجھے ہنسی آرہی ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے ہمیں جو اصول معاونت دیا ہے اس کی بنیاد پر ہی سارے معاملات کو آگے بڑھنا تھا اور وہی اصول معاونت قومیت کی بنیاد ہوں گے۔ ایک قوم وہ ہوگی جس کی بنیاد میرٹ پر ہوگی اور ایک قوم وہ ہوگی جو ڈی میرٹ کی ہوگی۔ میرٹ قائم وہیں ہوگا جب ساری پارٹیاں اس بات پر اتحاد کر لیں کہ ہم اپنا نام مسلک دیکھیں گی نہ مذہب، نہ زبان دیکھیں گی نہ علاقہ، نہ صوبہ، جو بات قانون دستور کی ہے اور اسلام کے مطابق ہے، یہ بات کہنے والے اب ملک میں لوگ نہیں ہیں یہ ایک المیہ ہے۔

مولانا محمد سلفی

پرنسپل جامعہ ستاریہ کراچی

رانا صاحب کے سوال اور ڈاکٹر شکیل اوج کے جواب کے درمیان ایک بات رہ گئی ہے کہ یہاں ایک یادو پارٹیوں کا سوال نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاملات چلانے اور سمجھانے کے لئے جو حکومت یا پارٹی اقتدار میں ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے۔ لہذا ہم کو موجودہ پارٹی یا حکومت کے ساتھ مل کر ملک اور قوم کی فلاح کے لئے کام کرنے کے لئے اتفاق رائے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

طلباۓ کے سوالات:-

سوال:-

طارق سلیمان، میسٹر کراچی یونیورسٹی

کیا اسلام کا یہ قانونی تصور کہ اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے اور تمام قوانین رب کی

جانب سے نازل کئے گئے ہیں کیا یہ بات پاکستان کے جمہوری نظام اور آئین کو اسلامی قرار دیتی ہے؟ اسلامی قوانین کی روشنی میں پاکستان کی آئین کی صورت کیا ہے؟

جواب:-

مولانا کبر حسین زادہ، وائس پرنسپل جامعہ الصادق کوئٹہ
اگر نظری اعتبار سے دیکھیں تو پاکستان کا آئین بہت واضح الفاظ میں اس بات کی خصانست
دیتا ہے کہ قرآن و سنت کی بالادستی ہو گی اور اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ خداوند کریم کی ذات ہو گی
اور یہاں کوئی قانون قرآن و سنت کے منافی نہیں ہو گا اس اعتبار سے اس کو غیر اسلامی قوانین کہا
جا سکتا ہے البتہ مقررین حضرات نے اس جانب اشارہ کیا کہ اصل معاملہ عمل درآمد کا ہے جہاں
اقتدار اعلیٰ خدا کو حاصل ہو وہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فراہمی کی خصانست ہوتی ہے۔ ایک
اسلامی ریاست اور سیکولر ریاست میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اسلامی ریاست میں حقوق اللہ اور
حقوق العباد دونوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس تناظر میں اگر ہم دیکھیں تو اس کا جواب اپنی ریاست
میں نفی میں ملتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جو نظام قائم ہے اس میں کوئی بھی چیز نتیجہ خیز دکھائی نہیں
دیتی لہذا ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ بہتر افراد آگے لا سکیں ہمارے مدرسوں اور سکولوں میں اچھے
لوگ تیار ہو کر آئیں۔ اسلام میں ساری مشکلات کا حل موجود ہے مگر ہمارے پاس اچھے افراد نہیں
ہیں جو ہمیں اچھے راستے کی جانب لے کر جاسکیں۔

سوال:-

عبد الباسط متعلم جامعہ اسلامیہ
اسلام نے طرز حکومت کہاں متعین کیا ہے اگر کہیں کیا ہے تو ہمیں بتائیں؟

جواب:-

مولانا محمد شفیع چترالی، کالم نگار روز نامہ اسلام
کوئی ایک طرز حکومت دنیا میں نافذ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ دنیا میں مختلف جغرافیائی حالات
ہوتے ہیں ہر معاشرے کے اپنے مسائل ہوتے ہیں کوئی ایک ایسا لگانہ حاصل ہے جس کی متعین کیا ہی نہیں
جا سکتا۔ اسلام نے ریاست کے لئے بنیادی اصول بتائے ہیں کہ اسلامی ریاست کو کتنے

اصولوں کے تحت کام کرنا چاہئے؟ اس کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو میں بتایا کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی فراہمی ممکن ہو اور قرآن مجید کی آیت سے یہ بات ثابت ہے کہ اگر ہم ان کو حکومت دیں تو وہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے نظام زکوٰۃ قائم کریں گے۔ علماء اس کی تشریع بھی کرتے ہیں کہ نظام صلوٰۃ سے مراد حقوق اللہ ہیں اور نظام زکوٰۃ کے اندر حقوق العباد آتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں حقوق اللہ اور اللہ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام ہوا یہ سے معاشرہ کا قائم کرنا ہی دین کا مقصد ہے اس کے لئے طریقہ کارکوئی بھی اختیار کیا جاسکتا ہے اور اسلام کی تاریخ کے اندر جو سب سے آئینہ میں نظام رہا ہے وہ خلافت کا ہے۔

سوال:-

شہزاد احمد معلم جامعہ نجیبیہ

سلفی صاحب نے فرمایا کہ ستا انصاف فراہم کیا جائے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ انصاف کے ساتھ لفظ ”مفہ“ استعمال کیا جائے اگرستے کا لفظ استعمال کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہیں رשות تو نہیں دی جا رہی۔ کہیں پیسے تو نہیں لئے دیئے جا رہے؟ دوسرا سوال ڈاکٹر شکیل اونج سے ہے آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید نے پارٹی بنانے کا کوئی اصول نہیں دیا۔ میرا سوال یہ ہے کہ اللہ تبارک نے ارشاد فرمایا کہ وہ رب جس نے تمہیں پیدا کیا تھم میں سے کچھ مومن ہیں کچھ کافر ہیں۔ اگر قرآنِ کریم کے ان مطلق الفاظ کو وسیع نظر سے دیکھا جائے تو ایک پارٹی موننوں کی بنتی ہے ایک پارٹی کافروں کی بنتی ہے۔ وہاں سے پارٹی کا اصول بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

جواب:-

مولانا محمد سلفی، پرنسپل جامعہ ستاریہ کراچی

بندی بات سنتے اور مہنگے انصاف کی نہیں بلکہ تطبيق شریعت الٰہی اور سنت محمد مصطفیٰ کی ہے جہاں بھی اللہ کا قانون اور نبیؐ کی سنت نافذ ہوگی وہاں خود بخود ستا انصاف مہیا ہو جائے گا۔ لہذا الفاظ سے دھوکہ نہ کھایا جائے بلکہ حقیقت کو سمجھنے کے لیے اللہ کی کتاب اور نبیؐ کی سنت سے رجوع کیا جائے۔

جواب:-

ڈاکٹر غلیل اوج، ڈین فیکٹی آف اسلام کے سٹڈیز جامعہ کراچی
آپ نے خود قرآن آیت پڑھ کر سنائی کہ ایک پارٹی کافروں کی اور ایک مسلمانوں کی،
آپ بتائیے کہ اس سے یہ کہاں استدلال کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی کئی پارٹیاں ہوں۔ دوسری
بات یہ کہ قرآن پاک کا اصول یہ ہے کہ مسلمانوں! آپس میں تفرقہ نہ کرو۔ تفرقے کے بارے میں
اتنا بیان کیا کہ یہاں تک کہ اسے مشرک سے بھی تعبیر کیا۔ ایک جگہ حضور اکرم گونا طب کر کے
کہا گیا کہ جو لوگ دین میں تفرقہ کر کے الگ ہو گئے اور اپنی پارٹی بنالی تو اے رسول آپ کا ان سے
کوئی تعلق نہیں۔ ہم آئندہ نلزم کی بات کر رہے ہیں بے شک اس میں بڑی دشواریاں
ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں جس کے پاس اقتدار آجائے اور اگر اس کے نظام سے کوئی خرابی پیدا
ہو رہی ہے تو کسی بھی طرف سے کسی بھی طبقے سے اگر کوئی اعتراض سامنے آتا ہے اور لوگ اس کو
درست سمجھتے ہیں تو سب لوگ حکومت سے بات کریں، کوئی پارٹی نہ ہو۔ اس طرح ان کی ہمدردی
ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح ہماری پارٹیاں ہیں سب اپنا مفاد دیکھتی ہیں۔ کالا باغ ڈیم آج
تک نہیں بن سکا۔ پتہ نہیں کتنا ایسے معاملات ہیں جو اختلاف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کی
پارٹیاں جب وجود میں آتی ہیں تو میرٹ کا قتل ہوتا ہے۔ اس لئے اگر آپ ایک پارٹی کے مقابلے
پر دوسری پارٹی کا تصور گھرائی میں جا کر دیکھیں تو اس کا مطلب بغاوت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا جب
نظم و نظم قائم ہو گیا اور اس کے مقابلے پر دوسری پارٹی کھڑی ہو گئی تو اس کا مطلب ہے کہ وہ باغی
ہے، جسے آپ نے جمہوریت کے لبادے اوڑھا دیتے ہیں۔ اگر انھیں اتار کر دیکھیں گے تو یہ
میں کوئی اور چیز نہ لے گی۔ پاکستان میں اتنی پارٹیاں ہیں لاحول ولا قوت اللہ باللہ، حیرت ہوتی ہے
کہ کون سی پارٹی ٹھیک ہے، عوام گمراہ ہو چکی ہے۔

سوال:-

محمد یاسین متعلم جامعہ اسلامیہ:-

بیان کیا گیا کہ پاکستان میں وزیر اعظم ہوتا ہے بادشاہ کوئی نہیں اور بادشاہت کا عہدہ اب
بھی ملکہ برطانیہ کے لئے ہے یعنی ہم اب بھی غلام ہیں۔

جواب:-

مولانا محمد شفیع چترالی، مذہبی سکالر و کالم نگار روزنامہ اسلام
 پر قدمتی یہی ہے کہ بربادیوں کا ایجاد سے آزاد ہونے والے جتنے بھی ممالک ہیں ان کی
 حکومت کا سربراہ وزیر اعظم کہلاتا ہے۔ میں نے یہی سوال اٹھایا تھا کہ اگر سب سے بڑا وزیر اعظم
 ہے تو پھر بادشاہ کون ہے؟ دستور میں تو لکھا ہوا ہے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے لیکن بھارت
 میں بھی وزیر اعظم ہے اور دیگر نوآبادیات جو آزاد ہوئیں ان میں بھی یہی ہے۔ علمتی طور پر بادشاہ
 کی کرسی ملکہ برطانیہ کیلئے خالی رکھی ہوئی ہے۔ میں نے دلیل دی کہ آپ کی پارلیمنٹ کے سپیکر
 نے 1998 میں باقاعدہ اس بات کا اعتراف کیا کہ ہم ابھی تک آپ کے زیر نکلیں ہیں۔ میرے
 کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ وہ ہم پر براہ راست حکومت نہیں کرتے لیکن یہ ستم بربادیوں جمہوریت
 کا حصہ ہے۔ ہم اس تسلسل میں ابھی تک چل رہے ہیں ہمیں اب اس سے نکلنا چاہئے۔ جب تک
 ہم اس سے نکلیں گے نہیں ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

جواب:-

مولانا سیف اللہ ربانی، مدرس جامعہ بنوریہ عالمیہ منتظم اعلیٰ وفاق المدارس پاکستان
 جمہوریت یونان سے شروع ہوئی وہاں خواتین کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ برطانیہ میں
 بھی طویل عرصے تک بہت سارے لوگوں کو ووٹ دینے کی اجازت نہیں تھی یہی حالت امریکہ کی
 تھی۔ ہم جس جمہوریت کا نام لیتے ہیں اور اس کی کوشش کرتے ہیں وہ شوریٰ کا نظام ہے۔ لیکن
 65 سال گزر گئے نہ وہ شوریٰ لاسکے نہ اس جمہوریت کو مشرف با اسلام کر سکے۔ کوشش جاری ہے
 بہت سارے لوگ اس جمہوریت کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں میرے خیال میں یہ زیادتی ہے اگر ہم
 اس کو کفر سے تعبیر کریں گے تو وہ سارے علماء جو اسلامی میں پنجھ اور جمہوریت کے حوالے سے کام کیا
 اس میں ہر مسلم کے لوگ ہیں بریلوی بھی ہیں، اہل تشیع بھی، اہل حدیث بھی، دیوبندی بھی
 ہیں۔ شاہ احمد نورانی، مفتی محمود، مولانا الازہری صاحب بہت سارے لوگ جدوجہد کرتے رہے
 لیکن جمہوریت کو راجح کرنے میں جو کام ٹھیں ان کو دور کرنے میں ہم نے کوئی خاطر خواہ
 کام نہیں کیا۔ نام تو جمہوریت کا ہے لیکن ہنچی طور پر یقیناً ہم غلام ہیں ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے

کہ ہم اس جمہوریت کو مزید بہتر سے بہتر کر سکیں۔

صدر ارتی خطبہ

مفتي ملیٹ الرحمٰن

چیئرمین مرکزی روپیت ہلال کمیٹی و صدر تنظیم المدارس پاکستان تمام اہل فکر و نظر اور اہل علم و فضل نے اچھی فاضلانہ، عالمانہ اور دانش پرمنی گفتگو کی اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تمام گفتگو کے نتیجے میں، میں چند باتیں کہنا چاہوں گا۔ اگر ریاستِ اسلامی ہے تو اس میں انصافِ مفت ہونا چاہئے کیونکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے اوپرین خطبہ خلافت میں جو اصول خلافت کے وضع کئے تھے اس میں بتایا تھا کہ تم میں سے جو کمزور ہے، مظلوم ہے، بے بُس ہے، عاجز ہے اور اپنا حق نہیں لے سکتا تو میرے نزدیک وہ طاقتور ہے تاوقتیکہ میں ظالم سے اس کا حق چھین کر اس کو لوٹانہ دوں اور جو طاقتور ہے، دہشت گرد ہے، دولت والا ہے، اثر و رسوخ والا ہے، اقتدار والا ہے میرے نزدیک کمزور ہے تاوقتیکہ مظلوم کا حق اس سے چھین نہ لوں۔ جب صاحبِ حق کو حق دلانا ریاست کی ذمہ داری ہے تو یقیناً وہ مفت اور بغیر کسی قیمت کے ہونا چاہئے۔ اگر کہیں کوئی آئینہ میں یا اتصواری اسلامی حکومتِ قائم ہو جاتی ہے میں نے ایک جملہ کہا تھا کہ مجھے اس جمہوریت سے امید نہیں ہے۔ میرے بھائی حضرت علامہ زادہ صاحب نے فرمایا کہ امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسباب ظاہری سے امید نہیں ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت مبارکہ ہے جو مشکلات القرآن میں سے ہے اللہ فرماتا ہے کہ "یہاں تک کہ جب رسول نما امید ہو گئے ما یوں ہو گئے تو انہوں نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا۔ بعض نے کہا کہ انہوں نے گمان کیا کہ ان کی فہم نے غلطی کی اور ظاہر ہے کہ رسول تو انسانیت کو امید دلانے آتے ہیں ما یوں کہاں ہوئے تو جب ہم نے مفسرین کی منفردین کو دیکھا تو انہوں نے لکھا کہ رسول ظاہری اسباب سے ما یوں ہو گئے، اللہ تعالیٰ کی رحمت و قدرت سے ما یوں نہیں ہوئے۔ کفار جو مسلمان ہو گئے تھے انہوں نے گمان کیا کہ رسول نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ گویا جھوٹ بولا گیا۔ مطلب یہ کہ ان کی توقع کے مطابق نصرت نہیں آئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہماری مدد پھر آگئی۔ اب اس مدد کے حصول کا وقت اللہ کے ہاں مقرر تھا بندوں کے

شیدول کے مطابق اس کا آنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ایک مسئلہ ہوا کہ ہمارا یہ آئین اسلامی ہے یا نہیں ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ اس کو اپنے دستوری میثاق کی رو سے اسلامی کہیں گے لیکن یہ مکمل اسلامی نہیں ہے کہ جس سے ہم مطمئن ہو جائیں کیونکہ اس میں تضادات اور ابہامات بھی موجود ہیں۔

نبیادی مسئلہ یہ ہے کہ جب تک آپ ڈرائیور سیٹ پر نہیں آتے۔ اس نظام میں خیر کا غالب آنا عملًا دشوار ہے، یہاں تو حال یہ ہے کہ اگر آپ مذہب کے نام پر کوئی تھوڑی سی تحریک شروع کر دیں تو آپ دیکھیں گے کہ دون بعد ایک شیعہ مارا گیا، ایک دوسرے مسلک کا مارا گیا ہے اور ایک تیسرا مسلک کا مارا گیا ہے وہ تحریک تو وہیں دھری کی دھری رہ گئی اب آپ میں اڑائی شروع ہو گئی۔ یہ جو ہمارے ہاں اڑا کا تنظیم بنی ہیں اس نے بھی بہت فحصان پہنچایا ہے اب حال یہ ہے کہ ہمارا حق بولنا بہت مشکل ہے ہر مسلک کے لوگ اپنی اپنی انہاں پسند تنظیم کو کشف نہیں کر سکتے اور اس کے غلط کو غلط بھی نہیں کہہ سکتے۔ جب تک ہم یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر اصلاح کیسے ہو گی۔ ہم نظریاتی بحثیں کرتے رہیں گے۔ آئین پاکستان اسلامی ہے یا نہیں۔ کوئی کہے گا کہ ہے اور کوئی کہے گا کہ نہیں، میں کہوں گا کہ جو کچھ ہے غنیمت ہے اور اس کو مزید بہتر بنایا جائے لیکن اس کو کفر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میں ایک مرتبہ ڈاکٹر اسرار کے پروگرام میں گیا وہ اس نظام انتخاب کے خلاف ہیں آپ جانتے ہیں وہ جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے تھے۔ میں نے کہا حضرت آپ نے 50 سال گزار لئے اور تقدیم کرتے رہے ان سیاسی جماعتوں پر جو انتخابات میں حصہ لیتی ہیں۔ میں نے کہا ب آپ نے کتنے بندے تیار کر لئے تاکہ میں ضرب لگا کر بتاؤں کہ ڈھائی ہزار سال یا پانچ ہزار سال بعد اتنے بندے تیار ہو جائیں گے تو اسلام غالب آجائے گا۔ اس لئے میرا نظریہ یہ ہے کہ جو سسٹم چل رہا ہے اس کو بالکل جنات کے حوالے کرنے کی بجائے جو لوگ بھی سسٹم میں حصہ لرہیں ہیں کم از کم یہیں بیٹھیں رہیں گے تو آوازہ تو گالیں گے۔ زمانہ ایسا ہے کہ آپ سسٹم میں ہیں تو آپ کی آواز کا وزن ہے اور اگر آپ سسٹم میں نہیں ہیں تو نہ ڈاکٹر ٹکلیں اوج کی آواز کا وزن ہے نہ میری آواز کا وزن ہے نہ کسی اور کی آواز کا وزن ہے۔ لہذا بہتری کی توقع رکھ کر اس کے لئے منصوبہ بندیاں کیجئے۔

دوسری نشست

صدرات: مولانا عبدالحق ہاشمی،

مرکزی رہنمایجاعت اسلامی بلوچستان و مشیر و فاقی شرعی عدالت

میزبان: محمد عامر رانا

ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

اس نشست میں ہم تین سوالوں پر اپنی توجہ مرکوز کریں گے۔

ایک مسلم ریاست میں حکمرانی کے طریقہ کار اور حکمرانی کا تعین کون کرے گا۔ دوسرا یہ کہ ہم شرعی بحث میں یہ کہتے ہیں کہ حکمران چند نمایاں خصوصیات کا حامل ہو، کون سا شخص یا ادارہ ایسی خصوصیات کے حامل شخص کی تقریبی کرے گا۔

کیا مسلمانوں کے لئے انتظامی، قانونی یا سیاسی دائرہ اختیار کی بنیاد پر علیحدہ وطن کا مطالبہ غیر اسلامی ہے؟ خاص کر جب دائرہ اختیار کی تقسیم اسلامی تاریخ کا حصہ ہو۔

پاکستان کے موجودہ آئین کے بارے میں آپ کی عمومی رائے کیا ہے اور آئین سازی میں علماء کا کردار کیا ہے؟

مولانا عبدالحق ہاشمی

مرکزی رہنمایجاعت اسلامی بلوچستان و مشیر و فاقی شرعی عدالت

جب ہم یہ ایسا نظام ہے جو معاشرے کے تمام افراد کی رائے سے تشکیل پاتا ہے۔ اگرچہ تمام افراد کی رائے سے نظام کی تشکیل ناممکنات میں سے ہے جب ہم یہ تشریفات جنہوں نے بھی کیں ان کی طرف ہم علماء کو جانے کی ضرورت نہیں ہے ہمارے مصادر فقہ میں جب ہم کی ایک اصطلاح معروف رہی ہے۔ اس اصطلاح میں جب ہم کے لئے کہیں افراد نہیں بلکہ اکثریت کا مفہوم مراد ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ہمارے پس منظر کے ساتھ مسلک مفہوم میں ہمیں کوئی تضاد نظر نہیں آتا ہیاں پر بھی جو کیفیت بنتی ہے وہ اکثریتی رائے ہی کے نتیجے میں بنتی ہے اور ہم جس

اصلاح کو جانتے ہیں اس اصطلاح کے اندر بھی بات یہی ہے کہ اکثریتی رائے کے نتیجے میں ایک نظام تشكیل پاتا ہے۔ دوسری چیز جو میں آپ کے سامنے ایک سوال کے طور پر رکھنا چاہتا ہوں، پچھلی نشست میں ہم نے نظری بحث کی ہے کہ جمہوریت ہمارے لئے قابل قبول ہے یا نہیں ہے۔ جمہوریت اپنی اساس میں کافرانہ نظام رکھتی ہے یا اس کے اندر اسلامائزیشن کا عمل ہو سکتا ہے یہ سب مذہبی نظری بحثوں کی ایک شکل ہو سکتی ہے۔ میں ایک عملی پہلوکی جانب آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ جمہوری نظام جیسا بھی سہی اس کی ابتداء خدا بیزار معاشرے سے ہوئی۔ یہ تصور کرنا یا خوش گمانی رکھنا کہ ایک کافر سماج سے اسلام کے حق میں کوئی نظام آئے گا یہ خود ایک غلط فہمی والی بات ہے۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ ایک چیز واقع ہو گئی ہے جیسے خشک سالی کے بعد اگر آپ قحط کے وجود پر بات کریں گے کہ اس کو مانوں یا نہ مانوں۔ یہ زیادہ سودمند بحث ہو گی یاد ٹھن آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، سیلا ب آ گیا، زنزالہ آ گیا۔ اس کے نتیجے میں کیا آپ اس کے وجود پر بحث کریں یا اس سے نکلنے کا کوئی راستہ تجویز کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت کا عملی پہلو دوسری جانب متوجہ کرتا ہے انسانی معاشرے اور تہذیب نے جوار تقاء حاصل کیا اس میں بہت ساری چیزوں کو انسانی معاشرے نے قبول کیا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ زناح و طلاق، بچوں کی پیدائش کی دستاویزی حیثیت کو ہم سب نے بھیتیت مجموعی قبول کیا ہے پہلے یہ نظام موجود نہیں تھا۔ مالیاتی نظام، درآمد و برآمد کے اصول، یہ سب چیزیں ہم نے جدید تہذیب کے نتیجے میں قبول کیے۔ یہ چیزیں عملاً ہمیں عہد نبوی میں نہیں ملتیں۔ اسی طرح سے بینکنگ کا نظام ہے ہم اس کے حق میں نہیں گریا ایک نظام ہے، اور عملاً اسے قبول کیا گیا ہے۔ اس میں ہم اصلاح کی کوشش کرتے رہے جس کی وجہ سے آج ایک متوازی نظام بھی سامنے آ گیا ہے۔ اس سے اختلاف، یا اتفاق ہمارا مقصد نہیں ہے۔ آپ کی سیرت سے ایک بات بہت واضح ہے کہ آپ نے لوگوں کو اصلاحات کی جانب راغب کیا۔ کسی نظام کو یکسر دکردینے کی پالیسی آپ کی سیرت سے نہیں ملتی۔ بلکہ اس کی مثال یہ ہے کہ غلامی ایک بہت بڑا جرم ہے گناہ ہے جب نبی کریمؐ پر نبوت کا تاج رکھا گیا تو معاشرے کے اندر غلامی ایک ناسور کی طرح موجود تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ دین جو حریت اور انسانی آزادی کا پیغام لے کر آیا ہے وہ یکسر اس کا انکار کر دیتا لیکن نبی کریمؐ نے ایسا نہیں کیا۔ ہم

دیکھتے ہیں کہ غلامی اسلام کے آنے کے بعد بھی موجود ہی لیکن آپ نے ایسی اصلاحات اس میں فرمادیں کہ بالآخر یہ نظام اپنی موت آپ مر گیا۔ ہمیں جمہوریت کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ میں اسے بہت بہترین نظام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ ایک خدا یزار معاشرے سے آیا اور ہمارے اوپر تھوپ دیا گیا۔ دوسری جانب ہمارے پاس اس نظام کے مقابل کے طور بھی کوئی نظام موجود نہیں ہے۔ اصلاحات سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم اس کے اندر اصلاحات تجویز کریں جس کے لئے وہ وقت بہم پہنچانا بہت ضروری ہے جو قوت ان اصلاحات کو نافذ اعمال کر سکے۔

ڈاکٹر ابی جاز صمدانی

پروفیسر و مفتی جامعۃ العلوم کراچی

اسلام ایک دین ہے جو انسان کی انفرادی زندگی سے لے کر معاشرے اور پوری ریاست کے بارے میں گفتگو کرتا ہے جب وہ تمام شعبوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو ریاست بھی اس میں خود بخود داخل ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اسلام کا نظریہ اعتدال پرمنی ہے نہ کہ افراط و تفریط پر، تفریط کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کو بحیثیت ریاست سیکولر چھوڑ دیا جائے اور اس کے لئے کسی نہ ہب کو تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ وہ نظریہ ہے جو انہوں نے مغرب میں متعارف کرایا۔ ظاہر ہے کہ وہ تفریط پرمنی ہے جو اسلام کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ اسلام کا اصل مقصد ہی ایک اسلامی فلاجی ریاست کا قیام ہے۔ عبادات اور دوسرے اعمال اس کے لئے بطور مبادی اور تہید کے ہیں جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں اصل میں ان کا استدلال قرآن کریم کی ایک آیت سے ہے، سورہ نور کی آیت: ترجمہ: وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان اور اعمال صالح کے نتیجے میں مقصود یہ کہ اسلامی ریاست و خلافت کا قیام ہو۔ لیکن بات واضح ہے کہ یہاں اسلامی حکومت و ریاست کا قیام بطور وعدہ و معمود کے ہے بطور مقصود کے نہیں ہے اور ہر معمود کا مقصود ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

عبادت کے بعد درجات ہیں ایک براہ راست عبادت جو نماز، روزہ ہے اور پھر دوسری بلا واسطہ عبادت، ریاست میں اسلامی احکام کا نفاذ کرنا بھی ہے۔ شریعت نے اس بارے میں بہت سارے احکامات دیئے۔ دوسری تصور حکومت ہے اس میں اسلام کے احکامات دو طرح کے ہیں۔

بعض احکامات ایسے ہیں جو دا اور دو چار کے ہیں اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ جیسے نماز کی رکعتیں ہیں روزے کی مقدار ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ البتہ دوسرے کئی احکامات ہیں جس میں شریعت نے چک رکھی ہے جیسا کہ لباس، اسلام نے نہیں کہا کہ آپ یہ پہنیں یہ نہ پہنیں، جو لباس شریعت کے مقاصد پورے کرے اسلامی ہے، بات ختم۔ اسی طرح شریعت نے حکومت کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ یہ ہوا رینہ ہو، بلکہ اس میں چک رکھی آپ دیکھیں کے چار خلافاء میں ہر ایک کا طریقہ انتخاب مختلف ہے۔ جناب حضرت ابو بکر صدیقؓ کو آپؓ نے صراحتاً خود منتخب نہیں کرایا البتہ کچھ رجحان ظاہر فرمادیا کہ ان کو امامت کے اوپر کھڑا کر دیا تو وہ صحابہ کرام کے لئے ایک قریبہ بن گیا۔ حضرت عمر فاروقؓؓ حضرت ابو بکر صدیقؓؓ نے متعین فرمادیا۔ عمر فاروقؓؓ نے آگے عثمانؓؓ متعین نہیں کیا بلکہ چھر کنی کمیٹی بنائی، حضرت علی المتصیؓؓ کا انتخاب ہنگامی حالت میں ہوا۔ شورش زده حالات میں مسلمانوں کی اکثریت نے دست بیعت بڑھا کر ان کا انتخاب کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے کوئی لگے بندھے طریقے نہیں دیئے کہ اس سے منہنے کی آپ کے پاس گنجائش نہ ہو۔ حالات سے اور زمانے کی ترجیحات کے تحت آپ ایک دائرے کے اندر رہ کر کام کر سکتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو بادشاہ ہوتا ہے وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات شائد درست نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤڈ کے بارے میں فرمایا کہ داؤڈ نے جالوت کو قتل کیا اور ہم نے اس کو بادشاہت عطا فرمائی۔ پھر دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے داؤڈ، ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنالیا ہے۔ مقدمہ ابن خلدون میں لکھا ہے کہ حکومت کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک کو ہم ملک طبعی کہتے ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے حکومت سازی کرنا۔ دوسرا ہے ملک سیاسی، یعنی عقل و فہم کے مطابق حکومت کرنا جو اس وقت مغرب میں رائج ہے۔ تیسرا قسم خلافت کی ہے۔ خلافت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ انسانوں کی دنیاوی اور اخروی فلاح کے لئے جو اقدامات اٹھائے جائیں شریعت کی روشنی میں وہ خلافت کہلائے گی اس کی مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں، شریعت میں اس کی اجازت موجود ہے۔ دوسرے سوال یہ ہے کہ کس طرح کی جمہوریت کو اسلامی قرار دیا جاسکتا ہے اور کس طرح کی جمہوریت غیر اسلامی قرار پائے گی۔ جمہوریت کی تعریف اور تفصیلات پر گفتگو ہو چکی ہے۔

جمهوریت سے مراد ہے کہ اکثریت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنا۔ کیا مجلس کے اندر اگر اکثریت ایک طرف ہوا رہا میر مجلس کی کوئی اور رائے ہو تو اکثریت کی بنیاد پر جو رائے آئے گی وہ امیر کی رائے پر فوقيت رکھے گی۔ فقہائے کرام اس پر دو رائے رکھتے ہیں۔ بعض علمائے کرام کی رائے ہے کہ امیر ان سے رائے تو لے گا لیکن ان کی رائے کا پابند نہیں ہو گا بلکہ آزاد ہو گا۔

قرآن کریم کی آیت نے بھی فرد واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے ”جب آپ (اکیلے) عزم کر لیں تو اس وقت ہی فیصلہ کریں گے“۔ لشکر اسامہ کے بارے میں جمهوری کی رائے تھی کہ لشکر کو روانہ نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن صدیق اکبر نے جمهوریت کی رائے کو قبول نہیں کیا اور فیصلہ کر دیا۔ اس کے برعکس بعض دوسرے فقہائے کرام کی رائے ہے کہ زیادہ افراد کی رائے کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک تو یہ کہ حدیث میں فقہائے کرام نے مشورے کی یہ تعریف کی ہے کہ مشاورت اہل علم سے لو اور پھر ان کی بات مان لیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت نے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے مشورہ کیا اور پھر ان سے فرمایا کہ اگر تم اس پر متفق ہو جاتے تو پھر میں تمہاری رائے سے اختلاف نہ کرتا۔ یعنی میں اسی بات کو مان لیتا جو تم کہتے۔ احادیث کے اندر آنحضرت کی رائے خروج کی نہیں تھی لیکن اکثریت کی رائے خروج کی تھی اور آپؐ نے اکثریت کی رائے کو مان لیا اور احادیث کے لئے خروج کر لیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اوقات اکثریت کی رائے کو بھی لینے کی گنجائش ہے۔ موجودہ حالات میں ہمیں اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ اگر ہم امیر مجلس کو سمجھ دوی اختیارات دے دیں کہ آپ جو چاہیں کر لیں تو خطرہ ہے کہ وہ اپنے ہی مفادات کو پیش نظر کر کے گا۔ اگر حالات ایسے ہوں کہ اس کو اکثریت کی رائے کا پابند بنانا ہو تو اس کی بھی گنجائش ہے البتہ اکثریت کی رائے کا پابند بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرف اکثریت جائے گی ہم ہر حال میں اس کو مانیں گے چاہئے قرآن و سنت کے خلاف ہو یا مطابق۔ اس کا نام ہے سیکولر جمهوریت یا لبرل جمهوریت۔ اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری چیز ہے اسلامی جمهوریت، اس کا مطلب ہے کہ ہم اکثریت کی بات کو تو مانیں گے لیکن اس میں شرط یہ ہو گی کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو اگر اس حد تک اس بات کو قبول کر لیا جائے تو اس کو ہم غیر شرعی یا ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ جب جمهوریت سیکولر ہو جاتی ہے تو وہ مکمل غیر اسلامی ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر

شرعی تقاضوں کا خیال رکھا جائے تو اس کو اسلام کے قریب کیا جاسکتا ہے اور ایک قابل قبول شکل بنائی جاسکتی ہے۔ اسلام میں فیصلہ سازی اور حکومت بنانے میں عوام کسی حد تک شامل ہو سکتے ہیں۔ بالخصوص خواتین کا اس میں کسی حد تک کردار ہوگا۔ جہاں تک یہ بات ہے کہ عوام کس حد تک شامل ہو سکتے ہیں ظاہر ہے کہ تمام عوام کو حکومت سازی میں شامل کرنا عملًا ناممکن بات ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آج کل بھی جو انتخابات ہوتے ہیں اس میں ٹرن اور چالیس یا پچاس فیصد ہوتے ہیں سو فیصد ممکن ہی نہیں ہوتا نہ ہو سکتا ہے۔ جمہوریت یونان سے آئی۔ اس وقت وہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں آٹھ دس ہزار کی آبادی ہوتی تھی وہ سب کو ٹھڑا کر کے پوچھ لیتے تھے۔ ہاں بھائی تمہاری کیارائے ہے وہ بتا دیتے تھے۔ لیکن اب اتنی بڑی آبادی ہے فرد افراد ارائے لینا ممکن نہیں۔ البتہ شریعت میں اس کی گنجائش موجود ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ جس چھرائی کیمی کے جیز میں تھے وہ خود امیدواری سے مستبردار ہو گئے پھر روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے مشورے لئے یہاں تک کہ خواتین سے اور مرد سے میں پڑھنے والے بچوں سے بھی پوچھا کہ تمہارا خلیفہ کون ہونا چاہئے۔ انہوں نے اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی کہ جس طرف اکثریت ہے اس کو مسلمانوں کا خلیفہ بنایا جائے۔ چنانچہ حکومت سازی کے لئے لوگوں سے رائے لینا ناجائز نہیں ہے۔ ناجائز یہ ہے کہ آپ خود ان سے مطالبہ کرو کہ مجھے خلیفہ بناؤ۔ از خود مطالبہ کرنا درست نہیں۔ اس لئے تبادل کے طور پر ایسا کوئی نظام بنالیا جائے۔ مثلاً ایکشن کمیشن آف پاکستان یہ کہہ کے ان صفات کے حامل افراد کی لست اس علاقے کے ممتاز لوگوں کے ذمہ کر دی جائے۔ مثلاً آئندہ مساجد، چاروں پانچوں مسالک کے جتنے بھی لوگ ہیں انہیں کہا جائے کہ اس حلقة میں سے دس لوگوں کے نام ہمارے پاس بھیجیں۔ پھر ان لوگوں کو خود انتخابی مہم چلانے کی اجازت نہ ہو بلکہ ایکشن کمیشن ان کو اپنے ہاں بلائے ان کے انٹرو یوز کرائے جو شائع ہوں۔ لوگ اس بنیاد پر فیصلہ کریں۔ رائے دہندہ کے لئے اٹھارہ سال کا ہونا ضروری نہیں آپ چالیس سال کی حدر کھلیں یا کوئی اور طریقہ کار اختیار کر لیں جس سے موجودہ حالات میں کسی قدر بہتری کی امید پیدا ہو سکتی ہے۔

خواتین کے سیاسی کردار کے حوالے سے ان سے مشورہ لینے کا ثبوت تولما ہے۔ صلح حدیبیہ کے اندر آنحضرتؐ نے ام سلمہؓ سے مشورہ لیا اور اس پر فیصلہ ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی بیٹی سے

پوچھا تھا کہ ایک عورت شوہر کے بغیر کتنے حصے تک رہ سکتی ہے؟ انہوں نے بتا دیا کہ چار مہینے تک رہ سکتی ہے تو انہوں نے اس کو بنیاد بنا لیا۔ جس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ عورت سے مشورہ لیا جاسکتا ہے لیکن کیا اس کو شوریٰ کا مستقل ممبر بنا کر ہر معاملے میں اختیار دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اس میں دورائے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مخصوص حالات میں مشورے کا ثبوت ہے عمومی حالات میں نہیں ہے۔ تاریخ میں بھی اس بات کے شواہد نہیں ملتے کہ خواتین مجلس شوریٰ کی رکن رہی ہوں، ہر مرتبہ نہیں ووٹ کا اختیار دینا مناسب نہیں۔ لیکن اگر ان دو واقعات کی بناء پر ہم انہیں اختیار دے بھی دیں تو اس کو مکمل طور پر غیر اسلامی کہنا مشکل ہو گا کیونکہ فی الجملہ اس کی اسلام میں بنیاد میں موجود ہیں۔

ایک اسلامی ریاست میں حکمران کا تعین کون کرے گا؟ میں نے چونکہ پہلے ہی عرض کیا کہ اسلام کے اندر لگبندھا اصول نہیں ہے۔ اسلام میں کسی بھی ذمہ داری کے لئے بنیادی طور پر دو شرطیں ہیں۔ قرآن میں دو جگہ آیا کہ القوی اور الامین۔ امین کا مطلب ہے امانت دار ہو، خائن نہ ہو، قوی کا مطلب طاقت والا نہیں بلکہ جس فن کی ذمہ داری اس کو دی جائے اس فن کو سمجھنے والا ہو اس کو ہم علم سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون اہل ہے اور کون نہیں ہے۔ پہلی چیز اس کی دیانت کو چیک کرنا ہے، دیانت کیلئے عام دنیا میں ہم جو معیارات اپنائے جاتے ہیں کہ وہ بلیک لست نہ ہو، نادہنده نہ ہو، اور اس پر بدیانتی کا کوئی اتزام بھی سامنے نہ آیا ہو۔ جب ہم کہتے ہیں کہ حکمران عادل ہو تو عدل کی ایک تعریف بہت پہلے کی گئی ہے کہ جو کبیرہ گناہ کا رنکاب نہ کرے اور اور صغیرہ پر اصرار نہ کرے۔ آج کل اس تعریف پر پورا اتر نے والا عادل شائد کوئی بھی نہ ملے۔ شاید بڑے سے بڑے مفتی صاحب بھی اس تعریف پر پورا نہ اتریں۔ اب فقہاء نے زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے عادل کی تعریف یہ کر دی ہے کہ جس کی نیکیاں زیادہ ہوں برائیاں کم ہوں، پس وہ عادل ہے۔

کیا مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ انتظامی، قانونی یا سیاسی دائرہ کی بنیاد پر غیر اسلامی ہے خاص کر جب دائرہ اختیار کی تقسیم اسلامی تاریخ کا حصہ ہے؟ اس سوال کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ متحده ہندوستان میں مسلمانوں نے الگ ریاست کا

مطلوبہ کیا اور آج کل پاکستان میں جس طرح کے مطالبات سامنے آ رہے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس وقت فقہائے کرام کے دو نظریات ہمارے سامنے ہیں ایک نظریہ یہ سامنے آتا ہے کہ اسلامی تصور کے تحت پوری دنیا کی خلافت ایک ہے۔ گلوبالائزشن کا تصور تو مغرب نے ابھی پیش کیا ہے۔ گلوبالائزشن کا تصور آنحضرت اور خلفائے راشدین سے شروع ہوتا ہے، بنوامیہ اور بنو عباس میں یہی رہا کہ ایک خلیفہ ہوتا تھا اور مختلف ملکوں میں اسکے گورنر ہوتے تھے نہ کہ مختلف خلیفہ ہوتے تھے۔ لیکن یہ سوال کہ مختلف ملکوں کے لئے الگ الگ حکمران بالذات ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ انتظام بڑا ہے اور ہم ایک ساتھ سنبھال نہیں سکتے تو انتظامی طور پر الگ حکمران منتخب کر سکتے ہیں اس لئے نہیں کہ ہم الگ الگ ہیں۔ علمائے کرام کی ایک جماعت نے اس کی اجازت دی ہے حضرت مولانا تقی عثمانی نے اپنی کتاب ”اسلام اور سیاست“ میں اس پر تفصیل سے بات کی ہے اور انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ باحالاتِ موجودہ جب کہ خلافت کا پوری دنیا میں عملاء و جو دنیں اس دوسری رائے کو اس معنی میں اختیار کرنے کی گنجائش ہے کہ ہم سمجھیں کہ موجودہ حکمران باوجود یہ کسی خلیفہ کے نائب نہیں اگر ان کے احکامات خلافِ شریعت نہ ہوں تو ہم اس کو مانے کے لئے تیار ہیں۔ اگر اس کی بنیاد سانیت پر ہے تو یہ سراسر غیر اسلامی ہے۔ اس لئے پاکستان کی بنیاد سانیت نہیں تھی۔ دو قومی نظریے تھے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کا تھا یہاں تک تو ٹھیک ہے لہذا یہ کہنا کہ ہم سرائیکی، سندھی یا بلوچی ہیں اور الگ ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس ان بنیادوں پر الگ خطہ اراضی کا مانگنا اس کا اسلام میں کوئی تصور نہیں بلکہ ممانعت ہے۔

ہمارے آئین کے بنانے میں علماء کا کیا کردار ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ 1956 میں 31 علمائے کرام نے ایک 22 نکاتی فارمولہ بنادیا وہ بہت شاندار ہے۔ لیکن جو اگلا آئین بنانا اس میں یہ نکات پوری طرح مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اگر ابھی بھی ان کے مطابق کچھ ہو جائے تو بہت سارے ابہامات دور ہو سکتے ہیں۔ اس کی شق نمبر 7 یا 8 میں یہ بات صاف لکھی ہوئی ہے کہ صدر ملک کے عام فرد کی طرح ہو گا اس کو قانون سے کوئی استثنی حاصل نہیں ہو گا۔ لیکن جب آئین بنایا گیا تو صدر کو استثنی دے دیا گیا۔ باقی چیزیں بحیثیتِ مجموعی اسلامی ہیں لیکن ان میں بہتری کی گنجائش موجود ہے۔

مولانا کا شفیع

پرنسپل مدرسہ الانصار کراچی

مدینہ کی فلاحتی ریاست، آج بھی ہمارے لئے ایک آئندی ہے اور کسی بھی اسلامی فلاحتی ریاست کے لئے روں ماذل ہے۔ اس سلسلے میں نبی اکرمؐ کے دوارشادات پیش کرو گا۔ حکمران بہتر اور بہترین بھی ہو سکتے ہیں ناپسندیدہ بھی ہو سکتے ہیں۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ بہترین حکمران وہ ہونے گے جنہیں تم پسند کرو گے اور وہ تمہیں پسند کریں گے تم ان کے لئے دعا میں کرو گے وہ تمہارے لئے دعا میں کریں گے اور رحمت کا باعث بنیں گے۔ اسی کے ساتھ آپؐ نے ناپسندیدہ حکمرانوں کے بارے میں بھی بتادیا کہ بدترین حکمران وہ ہوں گے جنہیں تم ناپسند کرو گے اور وہ تمہیں ناپسند کریں گے تم ان پر لعنت کرو گے وہ تم پر لعنت کریں گے۔ دوسری روایت میں جو سنتہ اہن ملجم کی ہے جس میں نبی اکرمؐ نے امامت صفری کے حوالے سے ذکر فرمایا کہ تین افراد ایسے ہیں کہ جن کے سروں سے نماز ایک گزر ابر بھی اوپر نہیں جاتی ان میں سب سے پہلے اس شخص کا ذکر فرمایا جو کسی قوم کو نماز پڑھائے یا امامت کرے اور لوگ اسے ناپسند کریں۔ جہاں امامت صفری کی یہ اہمیت ہے کیا امامت کبھی کے لحاظ سے اسلام کی کوئی تعلیمات نہیں ہوں گی۔

جب ہم اسلامی تاریخ کو پڑھتے ہیں تو ہمارے سامنے ایسے مفکرین کی طویل قطار ہے جو خود سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں۔ آج یہ کہنا آسان ہے کہ جمہوریت کے تمام ثمرات مغرب کے طفیل ہیں کیونکہ ہر طرف مغربی تہذیب کا ڈنکان ہر رہا ہے لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ اس کی اساس کہاں سے ہے۔ یونان کی روایتیں ایقونز اور سپارٹا کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو بہت دھندا لقصور ہے۔ ان معلومات کے نہیادی ذرائع کیا ہیں؟ کیا سیاسیات کے ماہر بتاتے ہیں کہ اسلام نے جو تصویر ریاست دیا وہ تو بہت واضح ہے مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہم اس کو مغرب کی یلغار کے آگے اجاگر نہیں کر پائے۔ آج اگر مغربی تہذیب میں تھوڑی بہت خوبیاں ہیں بھی تو وہ اسلام کے مر ہوں منت ہیں۔ حکومت کی اصلاح کے لئے پر امن طریقہ ہے، حضرت ابو بکر صدیقؓ جب خلیفہ منتخب کئے گے تو فرماتے ہیں کہ اگر تم مجھے حق پر پاؤ تو میری مدد کرو اور اگر تم کسی مرحلے پر یہ محسوس کرو کہ میں حق سے ہٹ رہا ہوں تو مجھے درست راستے پرلانے کی کوشش کرو،

حضرت عمرؓ کا ارشاد مبارک بھی ہمارے سامنے رہے کہ اگر مجھ میں کوئی طیز محسوس کرو تو مجھے سیدھا کرو۔

شورائیت کا ذکر قرآن کریم میں جا بجا ہے۔ نبی اکرمؐ نے خود اس کا اہتمام کیا۔ شورائیت کے لئے طریقہ کارجو بھی ہو، خلافت راشدہ سے بہت سارے نظائر مل سکتے ہیں نبی اکرمؐ کی تعلیمات، قرآن حکیم نے بھی جا بجا اشارے دیئے ہم اس کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔ ووٹ کے بارے میں جب ہم بات کرتے ہیں کہ عوام کو رائے دینے کا کتنا حق ہے؟ خواتین کے ووٹ کے حق پر بات کی جاتی ہے۔ ووٹ کے بارے میں تو قرآن کریم خود کہہ رہا ہے کہ شہادت کو چھپانا گناہ ہے اس کا مطلب ہے کہ جو ووٹ نہیں دیتا وہ گناہ کا رتکاب کرتا ہے۔ ووٹ دینا بھی ایک طرح کی شہادت ہے کہ آپ اپنے لوگوں کی شہادت دیتے ہیں۔ اس تو سط سے قانون سازی میں عوام کو شرکت کا حق ہے خواتین مشورہ دے سکتی ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک فوجداری مقدمات میں حد و وقصاص کے علاوہ دوسرے مقدمات میں عورت قاضیہ بن سکتی ہے۔ اس اعتبار سے کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عورت رائے دے سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں اس میں کوئی فرق بھی نہیں رکھا گیا۔ رہ گئی یہ بات کہ کیا حکومت پارلیمنٹ کی ممبر بن سکتی ہے یہ وہ معاملات ہیں کہ جن پر ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے ہمارے اکابرین اس پر رائے دیں۔

قانون سازی میں مغربی جمہوریت میں اکثریت کی رائے کو اہمیت حاصل ہے جبکہ شریعت کہتی ہے کہ قرآن و سنت برتر ہے۔ پاکستان کے آئین میں اس کا بندوبست کر دیا گیا ہے کہ اس میں شریعت کو سپر میںی حاصل ہے۔ اب یہ سوال ہم سب کے لئے ہے کہ ایسا عملہ کیوں نہیں ہے۔ اس میں کیا رکاوٹیں ہیں کہاں کہاں مشکلات درپیش ہیں اور ان کو کیسے دور کیا جاسکتا ہے البتہ اجتہادی اور انتظامی معاملات میں پارلیمنٹ کھل کر قانون سازی کر سکتی ہے اس کے لئے حدود بھی رکھی گئی ہیں۔ اسلامی نظریاتی کو نسل ہے اس اعتبار سے اگر ہم پاکستان کے آئین کو دیکھیں تو چند جزوی نظائر کے علاوہ مجموعی طور پر پاکستان کے آئین کو اسلامی قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے جب قرارداد مقاصد منظور ہو گئی تو ایک طرح سے پاکستانی ریاست نے کلمہ پڑھ لیا اور وہ مشرف ہے اسلام ہو گئی اب کہاں سقم موجود ہیں۔ ان کو دور کرنے کے لئے ہم سب کا فرض

بنتا ہے کہ ہم کچھ نہ کچھ کریں۔

علامہ عبدالحکیم آفریدی

ڈاکٹر کیث جزل شعبان الغرباء اہل حدیث کراچی

آئین کے اندر وہ شقیں جو غیر اسلامی ہیں ان سے ہم کس طرح نکل سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر صدر مملکت اور گورنر صاحبان جب عہدوں پر ہوں گے تو ان کے خلاف کوئی مقدمہ درج نہیں کیا جائے گا اور ان کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح صدر پاکستان کا یہ اختیار کہ وہ کسی بھی مجرم کی سزا ختم کر سکتے ہیں کم کر سکتے ہیں، متوسط کر سکتے ہیں یا بدل سکتے ہیں۔ اس لئے پاکستان کے آئین کو مجموعی طور پر اسلامی کہنا مجھ بھی ہے طالب علم کی سمجھ میں نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ ایک جج کو شواہد پیش ہوتے ہیں اور سارے مراحل سے گزر کر ایک مجرم کو سزا ہوتی ہے اس مجرم کو معاف کرنے کا اختیار قطعی طور پر صدر پاکستان کو حاصل نہیں ہونا چاہئے۔ قاتل کی سزا معاف کرنے کا اختیار مقتول کے وارثوں کو ہے چاہے وہ دیت لیں یا ویسے معاف کر دیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ زرداری کے دور میں سوں بکلوں کا جو کیس تھا اس کا تماشہ بھی دنیا نے دیکھا۔ اسی طرح یہ کہنا کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں، یہ نظریہ بھی مکمل طور پر قرآن سے متصادم ہے، قرآن مجید میں سورہ یوسف میں ہے کہ حکم اقدار اللہ رب العالمین کو حاصل ہے باقی نمائندے اللہ کے نائب ہیں۔ آئین کے اندر بہت ساری چیزیں اسلامی بھی موجود ہیں مثال کے طور پر صدر پاکستان کیلئے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ہم یہاں یہ بحث کر رہے ہیں اسلامی اور غیر اسلامی کی، میں آپ کے سامنے یہ اکشاف کر دوں گے کہ گزشتہ دو مینیس سے امن اور برداشت کے فور موں پر یہ بحث ہو رہی ہے کہ پاکستان کے صدر کے لئے مسلمان ہونے کی شرط کیوں رکھی گئی ہے۔ یہاں عیسائی اور سکھ موجود ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ شرط ختم کر دی جائے۔ اکابر علماء نے اس آئین پر دستخط اس شرط پر کئے تھے کہ دس سال میں غیر شرعی قوانین ختم کر دیئے جائیں گے۔ اب اگر یہ قوانین ختم نہیں ہوئے تو اس میں ہمارا ایک کردار ہونا چاہئے اور ہماری ایک قوتِ مراجحت ہونی چاہئے تاکہ آئین کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جاسکے۔ اس آئین کو ہم یکسر دنیں کر سکتے ہیں کیونکہ اس آئین میں قادیانیوں کو

غیر مسلم فرادریا گیا ہے۔

پروفیسر مرزا امدادیگ ڈائرکٹر الصدقہ اکیڈمی کراچی

اس وقت دنیا میں حکمرانی کے جو طریقہ کار مروج ہیں وہ یا تو Authoritarian ہیں یا ڈیمکریٹ ہیں یا پھر Consultative ہیں۔ فارم آف لیڈر شپ یا رولنگ پاور میں حاکم آمر ہوتا ہے۔ وہ جس چیز کو صحیح سمجھتا ہے اس کو نافذ کرتا ہے اس کے مقابلے میں کسی بات کو نہیں مانتا۔ دوسری فارم ڈیمکریٹ ہے کہ جمہور نے جو رائے دے دی حاکم وقت اسے مانئے کا پابند ہے۔ یہ دونوں طریقے اسلامی رواج کے خلاف ہیں۔ تیسرا فارم Consultative یعنی ایک شورائی مجلس ہو۔ شورائی حاکم وقت کو مشورہ دے۔ اگر وہ سمجھے کہ یہ امت کے مفاد میں ہے تو وہ اس پر عمل درآمد کرو سکتا ہے لیکن وہ اس رائے کو مانئے کا پابند نہیں ہے اگر وہ اس کے خلاف بھی فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس کا اختیار رکھتا ہے جیسے خلافائے راشدین خاص طور پر صدیق اکبر کے دور میں جب ارتداد کے مسائل پیدا ہوئے تو اس میں جمہور کی رائے یہی کہ جنگ نہ کی جائے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ نے بھی نبوت کے جھوٹے دعوے داروں اور مکرین زکوٰۃ کے خلاف ایکشن لینے سے باز فرمایا کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں یہ میں ان کے خلاف جنگ نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا میں ان کے خلاف جنگ کروں گا یہاں تک کہ ہم سب ہلاک بھی ہو جائیں پھر بھی ان کے خلاف جنگ کروں گا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام فارم آف لیڈر شپ کو سپورٹ کرتا ہے۔ جہاں تک طرزِ انتخاب کی بات ہے کہ حکمران منتخب کرنے کا طریقہ کار کیا ہو۔ اس سے پہلے بھی کہا گیا کہ چاروں خلافائے راشدین کا انتخاب الگ الگ انداز سے ہوا لیکن چاروں خلافائے راشدین کے انتخاب میں ایک قدر مشترک ہے کہ کسی نے بھی خود کو خلافت کے لئے پیش نہیں کیا۔ جب کہ آج ہر ایک دعویٰ کرتا ہے کہ میں وزارت عظمیٰ کا سب سے بڑا حق دار ہوں۔ اسلام جو نظام خلافت دیکھنا چاہتا ہے اس میں کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو امامت کے لئے پیش کرے۔ ہاں ایک ایسی جماعت جو

مرتبے کے لحاظ سے اس مقام پر ہو امیر کو منتخب کرے اور اس کے فیصلے کو عامتہ مسلمین قبول کریں۔ اس کے لئے طریقہ کار وضع کیا جاسکتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ کسی عام آدمی کے دوٹ کو کسی ڈاکٹر، کسی عالم یا مجتہد کے دوٹ کے برابر کر دیا جائے بلکہ ایسا طریقہ کار وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی مشاورتی تنظیم بنائی جائے جس میں ایسے افراد موجود ہوں جو تقویٰ، علم، رشد اور عقل کے اعتبار سے اس مقام پر فائز ہوں کہ ان کے فیصلے عامتہ الناس قبول کریں وہ معین کریں کہ ہمارا حکمران کون ہوگا اور کن خصوصیات کا مالک ہوگا۔ حاکم کی خصوصیات کے حوالے سے قرآن سے مختلف اشارے ملتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو نبی اسرائیل پر حاکم بنایا کہ وہ علم اور جسمانی طاقت کے اعتبار سے دوسرا لوگوں سے زیادہ بہتر تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمرانی کا تحفہ عطا فرمایا۔ کہیں حفیظ و امین ہونا شرط قرار دیا گیا اور کہیں کہا کہ تم میں سب سے زیادہ بہتر شخص وہ ہے جس میں تقویٰ ہو۔ اسلام کا طریقہ کار ضرور مختلف ہو سکتا ہے مگر ان معیارات کو ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا جن کا تعین قرآن و حدیث نے کر دیا ہے، حضرت عمر فاروقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ارشاد فرمایا جو ”البدایہ ولا نہایہ“ کے اندر بھی ہے کہ خدا کی قسم امیں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں غلام بنائے رکھوں بلکہ میں اللہ کا غلام ہوں پس حکمرانی کی ذمہ داری میرے پر دے ہے اگر میں اس کو امانت سمجھ کر تمہیں واپس کر دوں اور خدمت کے لئے تمہارے پیچھے پیچھے چلوں تو میں نے حق ادا کر دیا لیکن اگر تم اپنے مطالبہ حقوق کے لئے میرے پیچھے پیچھے چلو تو پھر میں کل اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گا۔ چنانچہ حاکم کا کام ہے کہ وہ عوام کے پیچھے جائے نہ کہ عوام درخواستیں لے کر ان کے پیچھے دوڑتی رہے۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ جس بندے کو اللہ نے حکمران بنایا اور اس نے رعایا کے ساتھ خیرخواہی برتنے میں لاپرواٹی کی وہ جنت کی خوبیوں بھی نہیں سوکھ سکتا۔ ہمارے وہ حکمران جو جھوٹے وعدے کر کے اقتدار کی سند پر پہنچتے ہیں انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ جس نشست کو وہ چلوں کی تیج سمجھ رہے ہیں وہ ان کے لئے جہنم کی آگ کا سامان بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کل ان کو جوابدہ ہونا پڑے گا کہ انہوں نے جو ذمہ داری لی ہے اسے پورا کیا کہ نہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کہتے ہیں کہ اگر فرات کے کنارے ایک کتنا بھی بھوکا مر جاتا ہے تو عمر سے کل اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ یہاں ہزاروں لوگ قتل کر دیئے جاتے ہیں اور کوئی پرسان

حال نہیں۔

جب تقسیم کا وقت آیا تو خدشہ تھا کہ جو نظام انگریز یہاں لاگو کرنا چاہتا تھا اس کے تحت ہندوؤں کا اکثریت تھی اور اقتدار ان کے پاس ہی رہتا۔ چنانچہ اس وقت کے علماء اور مفکرین نے اس بات کو محسوس کیا کہ وہ علاقے جہاں پر مسلمانوں کے اکثریت ہے وہاں اسلامی ریاست بننے۔ جہاں پر مسلمان اپنی تہذیب ثقافت اور اپنی مذہبی اقدار کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ آج بعض لوگ خاص طور پر قائدِ اعظم کے حوالے سے کہتے ہیں کہ شاید وہ سیکولر تھے اور پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ جس کو ہم قرار داوم مقاصد کہتے ہیں وہ 1949ء میں خود لیاقت علی خان نے پیش کی اور لیاقت علی خان وہ لیڈر ہیں جنہوں نے قائدِ اعظم کے شانہ بشانہ تحریک پاکستان کے لئے جدوجہد کی۔

جب پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں لیاقت علی خان قرارداد پیش کر رہے ہیں کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا اور یہاں قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکے گا۔ اس وقت کی اسمبلی میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ اگر وہ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ دیکھنا چاہتے تو کبھی بھی اس قرار داوم کو منظور نہ کرتے۔ یہی قرار داوم مقاصد بعد ازاں 1956ء اور پھر 1973 کے دستور کا حصہ بھی بنی۔ معلوم یہ ہوا کہ جو اس وقت کے لیڈر تھے جنہوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا انہیں معلوم تھا کہ ہمارا مقصد مسلمانوں کے لئے عیحدہ ریاست تھا جہاں قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزاری جا سکے اور ہندوؤں کے جبرا و استاد سے ان کی آزادی مل سکے اس لئے جس سرزی میں پر مسلمانوں کو خطرہ ہو تو اس پر مسلمانوں کیلئے عیحدہ ریاست کی کوشش کرنا خلاف اسلام نہیں بلکہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ جہاں تک آئین کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا تعلق ہے تو میں کہوں گا کہ اپنی روح کے اعتبار سے یہ اسلامی ہے مگر اس پر عمل درآمد کے حوالے سے ابہامات پائے جاتے ہیں۔ موجودہ حالات میں ہمارے لئے سب سے بہتر راستہ سیدنا محمد والیٰ کی تحریک ہے۔ جس طریقے سے اکبری دوری کے خلاف آپ نے جدو جہد کی اور تن تھا انقلاب برپا کیا حالانکہ وہاں تو دین اسلام کو اور اسلامی معاشرہ کو مسخ کیا جا رہا تھا، اسلامی احکامات کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ اسلام اور دیگر مذاہب کو آپس میں ملا کر ایک نیا دین گھڑا جا

رہاتھا ایسی صورت حال کے اندر مجد الدالف ثانی کا انقلاب ہمارے لئے مشتعل راہ ہے اور انہوں نے طالبان کی طرح پہاڑوں پر چڑھ کر بجادہ شروع نہیں کیا بلکہ انہوں نے کوشش کی کہ بادشاہ کے مصالحین کی اصلاح کی جائے۔ اگر بادشاہ کے مشیر اور قریبی لوگ ٹھیک ہو گئے تو وہ بادشاہ کو صحیح رائے دیں گے جس کے بعد نظام حکومت خود بخوبی بہتر ہو جائے گا۔ آج بھی اگر ہمارے علمائے دین بجائے جہاد کا حکم دیں پہلے مرحلے کے اندر وہ پار لیمان کے اندر کے لوگوں اور وزیر اعظم کے قریبی افراد پر توجہ کریں اور ان کی اصلاح کریں تاکہ وزیر اعظم کو بہتر مشورے ملیں اور ہمارا نظام حکومت بہتر ہو سکے۔

جناب مولانا سید احمد بنوری

مدرس جامعہ اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

اسلام کا نظام حکومت و ریاست، مجھے کہنے دیجئے کہ یہ ایک پاماں موضوع ہے اس صدی میں اس پر بختنا کام ہوا ہے اور جتنی تحریریں سامنے آئی ہیں شاید ہی کسی اور موضوع پر کام کیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ مطالبہ بھی ہمارے سامنے کیا گیا کہ اسلامی قانون میں اجتہادی شان نظر نہیں آتی اور اجتہادی طریقے سے نی چیزوں پر کام نہیں کیا گیا یہ ایک واحد کام ہے جس پر بہت کام کیا گیا۔ تاحال کتاب میں لکھی جا رہی ہیں دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ تجربات بھی کئے گئے ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ مسلمانوں نے اگر کوئی کام کیا ہے تو یہی کام کیا کہ مسلمانوں کا تصور ریاست کیا ہے؟ حکومت کیسی ہونی چاہئے؟ حکومت قائم کیسے قائم کرنی چاہئے؟ اس کے لئے تمام تجربے بھی انہوں نے کر ڈالے۔ سیاسی جماعتیں بنائی گئیں، سعودی عرب میں بادشاہت کو اسلامائز کیا گیا۔ ایک خاص مقصد کے لئے ایران کے اندر تھیکو کریں کا نظام قائم کیا گیا۔ دوسرے طریقے سے افغانستان میں نظام لایا گیا۔ پاکستان ایک جمہوری سوچ، اقبال اور قائد اعظم کی سوچ کا نمائندہ ہوا۔ اس کے باوجود آج تک یہ سمجھ نہیں آیا کہ ہم کہنا کیا چاہتے ہیں اور کرنا کیا چاہتے ہیں۔ میں طالبعلماء رائے کے تحت مسئلے کے ابھام کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسئلہ پیدا کیوں ہوا۔ ہم چیزوں کو ان کے مظاہر سے اٹھاتے ہیں۔ مثلاً آپ سے میں سوال پوچھتا ہوں کہ

اسلام کے تصور میں ہوٹل کیسا ہوگا۔ ہوٹل کیسے قائم کئے جاتا ہے۔ مثلاً اس کے اندر کمرے کتنے ہوں گے۔ لابی ہوگی؟ سوئنگ پول ہوگا! ایک رائے یہ بھی ہوگی کہ اسلام میں ہوٹل نہیں تھے اس لئے ہوٹل ہونے ہی نہیں چاہیں۔ یا پھر مشاہیتیں تلاش کریں گے کہ فلاں زمانے میں سرائے تھیں اس کے پیچھے ایک تالاب تھا اس لئے اسلام میں پول بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام کے تصور ہوٹل میں پول بھی ہونا چاہئے۔ یہ وہ مقصود ہے کہ جس کی وجہ سے پوری ایک صدی کام ہونے کے باوجود آج ایک بار پھر ہم یہ طے کرنے بیٹھے ہیں کہ ہم اس کے بارے میں طے شدہ رائے رکھیں۔ اس لئے میری رائے یہ ہوگی کہ ہم ٹوڈی پوانٹ کچھ چیزیں طے کروانے کی کوشش کریں۔ ورنہ اسلام کے طرز ریاست میں جتنا آپ پوچھتے چلیں جائیں گے وہ اپنے مطابق آپ کو بتاتا چلا جائے گا۔ نہ اس کا حل پیش ہو گا نہ معاملہ حل ہو سکے گا۔ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے چیزوں کو اسلام کے سابقے اور لاحقے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ اسلام سے مطالبہ کریں کہ وہ ہمیں ریاست کا تصور دے دے۔ اسلام ہمیں پورے کا پورا ابیننگ سسٹم دے دے۔ اسلام بتائے کہ سکول کے اندر کلاس کس طرح ہونی چاہئے۔ اسلام ہمیں بتائے کہ فوج کے اندر ریننگ کیا ہونی چاہئے۔ اور اگر یہ چیزیں نہیں ملیں گی تو ہم دو کام کریں گے یا تو اس کو سرے سے غیر اسلامی فرادریں گے یا پھر بر قعہ پہنا کرائے اسلام بنانے کی کوشش کریں گے۔ اسلام کے اندر بر قعہ پہنا کر اسلامائزشن کا بڑا لچسپ کام ہوا ہے۔ اسلام خدا کا دین ہے وہ محمد رسول اللہ سے شروع نہیں ہوا آدم سے شروع ہوا۔ یہ پیغمبری کے ذریعے انسانوں کو آگاہ کرتا ہے۔ نظام انسان بنایا کرتے ہیں ریاستیں انسان بنایا کرتے ہیں اس میں تجربات شامل ہوتے ہیں اس میں تمدن شامل ہوتا ہے اس کے اندر تہذیبوں کا ارتقاء شامل ہوتا ہے۔ اسلام کے اصولوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ کیا اس میں اصول کی غلطی ہو گئی یا اصولاً یہ چیز غلط ہے یا اصول صحیح ہو گیا ہے مگر عمل درآمد میں غلطی ہو گئی ہے پھر میں ہوٹل کی مثال دوں گا کہ اسلامی ہوٹل کوئی نہیں ہو گا۔ صرف اتنا دیکھا پڑے گا کہ کیا اسلام میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ کہیں پر انسان اجنبی طور پر کسی شہر میں جائے تو کرائے پر مکان لے کر رہنا شروع کر دے اس کے بعد ہوٹل، فائیو سٹار، سیلوں سٹار یہ معاشرے میں تمدن کی ضرورت کے طور پر دیکھیں جائیں گے یا یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اہم چیز یہ دیکھی جائے گی کہ اگر ہوٹل

بن گیا ہے کیا اس کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلا بایا جا رہا ہے، کوئی دھوکا دی تو نہیں ہو رہی غیر اخلاقی حرکت تو نہیں ہو رہی ان چیزوں سے فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم اس کو درست قرار دیں یا نہ دیں۔ یہاں جمہوریت پر گفتگو ہوئی ہے۔ یہ بات بڑی سادہ ہے کہ جمہوریت ارتقاء سے گزری ہے اور اس میں نئی تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ جو سادہ مسئلہ ہے اس کو حل کیجئے۔ میرے خیال میں علماء کو دو ٹوک طریقے سے اپنی رائے سامنے رکھ دینی چاہئے وہ یہ کہ حکومت کیسے قائم ہو۔ منطق کا ایک ادنی طالب علم ہونے کی وجہ سے اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو خدا ہمارے لئے ایک چیز طے کر دے اور بتائے کہ یوں کیا جائے گا۔ خدا عالمًا طے کردے کہ تم میں سے فلاں آدمی بڑا ہو گا پیغمبر بھی خدا کے نمائندے بن کر آتے ہیں اور وہ خدا کے نمائندے کی حیثیت سے لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ اس کے بعد مختصر طور پر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ یا تو ہم آپس میں اتفاق رائے سے فیصلہ کر لیں اگر ایسا نہ ہو سکے تو اکثریت سے فیصلہ کر لیں ورنہ جس کی لاٹھی اس کی بھیں کی طرح غلبہ قائم کر لیں۔ حکومت کیسے قائم ہوگی۔ تصور ریاست کے بارے میں دو چیزوں کا آپ کو فیصلہ کرنا ہے یا تو بتا دیجئے کہ کس آدمی کو حکمرانی کا حق اللہ نے دیا ہے۔ وہ پیغمبر کے بعد کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد دو ہی صورتیں ہیں یا تو غلبے سے حکومت قائم ہوگی یا اتفاق رائے سے قائم ہوگی۔

یہ چیز اسلام کے اول دور کے اندر میں ہی طے ہو گئی تھی۔ آپ کی جانشینی وہ پہلا مرحلہ تھا جس کے بعد فیصلہ ہو گیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں گروہ بندی ہو گئی۔ یہ پہلی گروہ بندی تھی جس کے نتیجے میں شیعہ حضرات اور سنی حضرات الگ الگ حیثیت میں سامنے آئے۔ گروہ بندی کس نام سے ہوئی کہ آیا امامت منصوص ہوتی ہے اس کا تقرر پیغمبر کرتا ہے یا اس کا تقرر عوام کرتی ہے۔ شیعہ حضرات کی رائے تھی اور وہ اس رائے کے ساتھ دلائل پر قائم ہیں کہ امامت اصل میں منصوص ہوتی ہے اور اس کا تقرر پیغمبر کر کے جایا کرتے ہیں اور پیغمبر ہی کو کر کے جانا چاہئے۔ دوسری رائے اہل سنت حضرات کی یہ تھی کہ اب جو کچھ بھی ہو گا عوام فیصلہ کرے گی عامۃ المسلمين طے کریں گے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت اس بنیاد پر قائم ہوئی اور یہ چیز اہلسنت کا شعار بن گئی کہ

ہمارے لئے امامت منصوص نہیں ہوگی۔ اب اگلا سوال جس سے ابہامات جنم لیتے ہیں کہ عوام نے فیصلہ کرنا ہے اور اگر اس کے بارے میں آپ ایک سے زائد رائے اختیار کریں۔ اس کے لئے شوریٰ کا لفظ استعمال ہوا، یہ چار طریقے نہیں ایک ہزار ہو سکتے ہیں تبدیلیاں آرہی ہیں آپ دیکھیں گے کہ وہ میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر فرق آرہا ہے۔ یہ فرق اور بڑھتا چلا جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ سوئٹر لینڈ کے اندر عورت کو ووٹ کا حق گزشتہ صدی کے اندر حاصل نہیں تھا یہ بہت قریبی زمانے میں ان کو دیا گیا۔ اس لئے کہ معاشرے اور تمدن کے ساتھ آپ فیصلے کریں گے کہ آپ نے کس سے رائے لینی ہے لیکن یہ بات چاروں خلافاء نے طے کی کہ حکومت اصطلاحاً حاصل نہیں ہو سکتی یہ عوام کی رائے سے حاصل ہوگی اور اس کو حضرت عمر فاروقؓ نے بخاری کی روایت میں واضح فرمادیا ہے کہ مسلمانوں کی رائے کے بغیر خلافت نہیں ہو سکتی۔ جناب حسینؑ کا معاملہ جب درپیش ہو تو ان کے بارے میں دورائے ضرور تھیں کہ آیا ان کو یہ اقدام کرنا چاہئے تھا یا اس قدم کی حیثیت کیا تھی مگر اس میں کوئی اختلاف نہیں رہا کہ یہ زید کی حکمرانی غلط تھی۔ اس لئے کہ وہ عدل کی بنیاد پر نہیں تھی۔ ہمارے ہاں عوام کی مرضی کے بغیر حکمرانی کا کوئی جواز نہیں۔ اس لئے میر آپ سے سوال ہے کہ اگر ووٹ کا حق اس کرے میں صرف اس شخص کو ملتا چاہئے جس کی ٹوپی بڑی ہو، جس کے پاس علم زیادہ ہو، اس بات کو آپ طے کیسے کریں گے یہ سوال ہے۔ ہر سوال پر دوسرا سوال آجائے گا یہاں پر کہا گیا کہ اہل علم کو ووٹ کا حق ملتا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ اہل علم کون ہو گا۔ دو ہی طریقے ہیں کہ یہاں موجود اکثریت فیصلہ کرے کہ اہل علم کون ہے یا وہ زبردستی خود کو منوا لے گا۔ ہمارے ہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ پاکستان میں ہر آدمی کو ووٹ کا حق نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ آپ کیوں کہتے ہیں کہ 18 سال کا آدمی جاہل ہے اگر آپ عالم ہیں تو 18 سال والا آپ کو خود بخود عالم مانے گا۔ میں اس بات میں بالکل واضح ہوں کہ اسلام کے اندر جو بھی ریاست کا نظام قائم ہو گا وہ بہر کیف عوام کی مرضی کے ساتھ قائم ہو گا۔

سوال یہ ہے کہ بندہ بالغ ہونے کے بعد اپنے فیصلے خود کرتا ہے آپ اسے سمجھا سکتے ہیں فیصلہ اس کو خود کرنا ہے۔ پھر آپ یہ کیسے کہ سکتے ہیں کہ اس کے نام پر میں زبردستی کروں گا۔ لہذا میرے نزدیک فرد آزاد ہے اور وہ پابند ہے اپنے اللہ کے حضور۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثریت

کیا حق و باطل کا معیار بنے گی۔ کوئی اقلیت خود کو حق کا نامانندہ قرار دے کر اکثریت پر حکمرانی نہیں کر سکتی اس کی کوئی گنجائش اسلام کے اندر نہیں۔ اس لئے میرا نقطہ یہ ہے کہ علمائے کرام سمجھ لیں کہ دنیا میں آپ کو خلافت نافذ کرنی ہے، جمہوریت لانی ہے یا سیکولر ازم۔ یہ سب زبردستی کی بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کا حکم ہے کہ ہم پر زبردستی کرنے کا حق کسی کو نہیں جس کو کرنا ہے اکثریت کی بنیاد پر صرف وقتی طور پر فیصلے کر سکتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے واضح کروں کہ شراب پا کستان میں بھی حرام ہے اور اللہ کے ہاں بھی۔ برطانیہ میں بھی حرام ہے اللہ کے ہاں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ چونکہ برطانیہ میں اللہ کے مانے والوں کی اکثریت نہیں ہے لہذا شراب قانوناً جائز ہو جائے گی۔

پاکستان میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت ہے لہذا شراب قانوناً بھی حرام ہو جائے گی۔

اس کے بعد آپ نے کہا کہ علیحدہ وطن یاریاست کے بارے میں اپنی ناقص رائے دوں، میرے نزدیک یہ تمن کا ارتقاء ہے اس کا فیصلہ ایک صدی بعد ہی ہو گیا تھا۔ بنوامیہ اور بنو عباس کی دو الگ سلطنتیں مسلمانوں میں قائم رہیں۔ فتحاء نے بات کی کہ ایک سے زیادہ امیر نہیں ہونے چاہیں ان کا یہ اصول نہیں تھا کہ وہ کسی تمنی ارتقاء کا راستہ روکنا چاہ رہے تھے سیدھا اصول یہ تھا کہ ایک سے زائد امیر ہوں گے تو اختلاف ہو گا۔ یعنی ایک کمرے میں اگر ہم رہیں گے تو کسی ایک کو بڑا بنا کیں گے یا ان حدیثوں کی بنیاد ہے کہ جن میں کہا گیا کہ ایک امیر کی موجودگی میں دوسرا امیر نہ ہو۔ ولچسپ بات یہ ہے کہ اس روایت پر ہم پورے مسلمانوں کا ایک خلیفہ مانے کو تیار ہیں لیکن پاکستان کے اندر ہر کوئی نئی خلافت قائم کرنے کے لئے بے تاب نظر آتا ہے۔ پوری دنیا میں ایک خلافت ہونی چاہئے لیکن ہر دوسرے محلے میں الگ خلافت ہونی چاہئے جو دست گریبان بھی رہیں۔ میرے نزدیک اس ایک نقطے پر اگر ہم نہیں آئیں گے تو فیصلہ کون کرے گا۔ میں بھی قرآن بیان کر رہا ہوں مولانا اعجاز حیدر صاحب بھی قرآن ہی بیان کریں گے۔ مولانا سلفی صاحب نے بھی قرآن بیان کیا ہے اب ہم تینوں میں اختلاف ہوا ہے، فیصلہ کون کرے گا۔ پاکستان میں بھی اکثریت سے فیصلے ہوتے ہیں۔ میں ایک بات کہوں گا کہ اسلام کے اندر کسی کو حق نہیں ہے کہ اکثریت کے خلاف کوئی اقلیت ہم پر حکمرانی کر سکے۔

مولانا اعجاز حیدر مظہری

ریسرچ سکالر لائز ہر اکیڈمی

قرآن کریم کا واضح فیصلہ ہے حکومت الہیہ ضرورت دین ہے۔ قرآن کریم میں کئی آیات ہیں کہ کسی کا حکم نہیں چلتا اللہ کے حکم کے بغیر، اس میں کسی کوشک نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہمیں مغربی طرزِ حیات اپنانا ہے۔ حالانکہ مغرب کے ہاں انسانیت کا تصور نیا نیا ہے کئی ممالک نے خواتین کو ووٹ، وراثت کے حق حالیہ سالوں میں دیئے۔ یورپ کی تاریخ پر ہیں یہ لوگ فذاق تھے کیا ہمیں ان سے جمہوریت سیکھنی پڑے گی۔ ہمارے پاس الحمد للہ جمہوریت بطور اتم موجود ہے۔ ہماری جمہوریت عقلی ہے، کسی انسان کو کسی انسان پر حکومت کا حق نہیں مساواۓ دلیل کے، اب دلیل حکومت الہیہ کی ہے جس کے وارث انبیاء، اولیاء ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے امام اس وقت پرده نگیب میں ہیں ہمارا فتویٰ بھی یہی ہے کہ جب امام تک رسائی نہ ہو تو علماء پر حکومت بنانا واجب ہے۔ ہمارے ہاں جمہوریت نسب بھی ہے اور انتخاب بھی، انتخاب کیا ہے ہر شخص جو مکف ف ہے، ہماری فقہ میں نوسال کی پچھی پر نماز بھی واجب ہے وہ مکف ہو گئی۔ لڑکے میں یہ عمر ۱۵ سال ہے چنانچہ ہر وہ فرد جو شرعی لحاظ سے مکف ہے ووٹ کا بھی حقدار ہے۔ مکف کو حق رائے دہی ہے جس طرح مرد کو اس طرح عورت کو، عورت کو جب ووٹ کا حق ہے تو وہ پارلیمنٹ کی ممبر بھی بن سکتی ہے مگر حکمران نہیں بن سکتی اسلام کے اندر عورت حکمران نہیں بن سکتی۔ آپ واقع کو دیکھ لیں کہ جب ہدہ گیا تو اس نے بتایا کی مجھے حرمت ہے کہ وہاں عورت حکمران ہے۔ قرآن نے اس بات کو اور علماء نے واضح کیا ہے میں چند علماء کے نام لیتا ہوں علماء ماوردی نے ایک کتاب لکھی ہے ”الا حکام السلطانیہ“، مولانا عبدالکریم خطیب نے ”الخلافۃ ولا مامہ“، ابن قدامہ نے معنی کے اندر ”تفصیل لکھی باقی تمام علماء نے مسئلہ کو طے کیا ہے۔ میں دو تین طریقے جس طرف علماء اشارہ فرمائے ہے تھے ایک یہ ہے کہ منصوص من اللہ، چونکہ اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اصل رائے یہ ہے کہ اہل نظر افراد حکم اسلامی کا انتخاب کریں گے حق رائے دہی سب کو ہے لیکن ان کو یہ حق نہیں کہ کسی فاسق شرایب کو منتخب کریں۔

علامہ سید عقل الجم قادری

مدیر ماہنامہ فقہ و سیکرٹری جز لجمیعت علمائے پاکستان سندھ

مجھے علماء کی ایک مخالف میں جانے کا اتفاق ہوا وہاں پر موضوع بحث یقہا کہ سندھ اسمبلی نے اسلامی نظریاتی کو نسل کے خلاف ایک قرارداد پاس کر دی ہے۔ وہاں 1857ء کی جنگ آزادی سے بحث کا آغاز کیا گیا اور اعلان جہاد پر زور دیا جا رہا تھا۔ میں نے عرض کی آج کیا وجہ ہے کہ پاکستان کی دیگر صوبائی اسمبلیوں کے اندر علماء اور مشائخ موجود ہیں لیکن سندھ اسمبلی کے اندر ایک بھی عالم یا عالم نما موجود نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے انتشار سے لبرل عناصر کو موقع دیا کہ وہ علماء کو اپنے برابر میں نہ بیٹھنے دیں۔ یہاں پر اہل علم افراد موجود ہیں، ہم نے تمام دنیا کو دو حصوں میں رکھا ہے ایک امت اجابت اور ایک امت دعوت۔ میں نے کہا کہ جب آپ کفار کو، بتوں کو پوچھنے والوں کو امت دعوت کے اندر سمجھتے ہیں۔ اسمبلی کے اندر بیٹھنے والے کلمہ طیبہ پڑھنے والے ہیں آپ ان کے خلاف اعلان جہاد نہ کریں ان کے خلاف انہیاں ندانہ فتوے اور فیصلے صادر نہ کریں بلکہ ان کے ذہن کو بدلتے کے لئے یہاں جوبات ڈاکٹر بیگ نے کی کہ کیسے حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات کے ذریعے اذہان کو تبدیل کیا اکابر کے ارد گرد جو لوگ موجود تھے اور پھر دین الہی کا تیہ پانچھ ہو گیا۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ یہاں پاکستان کی دینی و سیاسی جماعتوں کے قائدین تشریف فرمائو تے، جو عوام کے اندر بات منوانے کی قدرت نافذہ رکھتے ہیں۔ ہم ٹھہرے ممبر پر بیٹھنے والے جن کے سامنے چار پانچ سو افراد ہوتے ہیں۔ پاکستان کے اندر اٹھاڑہ کروڑ افراد کے اذہان وہی تبدیل کر سکتے ہیں جو ان پر اثرات رکھتے ہیں دوسرا بات یہ کہ اس بحث کے اندر ان طبقات کو بھی بلا یا جاتا جو اس جمہوریت کو فریا مبارہ سمجھتے ہیں ان طبقات کے درمیان بحث ہوتی اور پھر کوئی فیصلہ ہو جاتا۔ ہاں ایک بات پر اتفاق سامنے آیا کہ جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کر لیا جائے تو یہ ہمارے لئے قابل قبول ہے اس کے اندر سیکولر ازم کو کمال دیا جائے کچھ اصولوں کو متعین کر دیا جائے۔ تقویٰ کو معیار بنادیا جائے تو یہ جمہوریت ہمارے لئے قابل قبول ہے۔ ایک بات جس کو ہمارے دینی طبقے نے بھی نظر انداز کر دیا کہ 1970 سے لے کر 1977 تک میری جماعت کے قائدین علامہ

شاہ احمد نورانی، جماعت اسلامی کے مولانا مودودی، مولانا طفیل محمد صاحب، مولانا مفتی محمود صاحب، یہ تمام دینی جماعتیں اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ ہر شخص اس بات کے لائق نہیں ہوتا کہ وہ اپنی قیادت کو منتخب کر سکے کیونکہ وہ علم و تقوے کے اس معیار پر فائز نہیں ہوتا جتنا پچ ان لوگوں نے متناسب نمائندگی کا اصول متعین کیا تھا کہ جو جماعت جتنے ووٹ حاصل کرے اس کی بنیاد پر اس کی اسمبلی میں سیٹیں ہوئی چاہیں۔ وہ جماعت اپنے اندر سے اہل علم اور اہل تقویٰ افراد کو اسمبلیوں میں بھیجے گی۔ جو جمہوریت ہمارے سامنے ہے مصیبت یہ ہے کہ پاکستان میں کوئی بھی چیز خالص نہیں ملتی ہر چیز دونبڑ ہے پاکستان کی جمہوریت بھی دونبڑ ہے۔ اس سے اس ملک کی آمریت بہتر ہے جہاں عدل ملتا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کے نام پر بوری بندلاشیں ملتی ہیں مگر مجھوں نے پورے ملک کی میشیت کو تباہ کر دیا ہے۔ آنے والی نسلوں کو مقروظ کر کے چلے جاتے ہیں کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں ہے۔ جب تک اصل جمہوریت سامنے نہیں آئے گی تب تک ہم کیسے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جمہوریت کیا ہوگی۔ پاکستان کے اندر 1973ء کا دستور نافذ ہے یہ واقعتاً ایک مقدس دستاویز ہے۔ جس کو اس وقت کے باصول سیاستدانوں، جید علمائے کرام اور اہل علم نے اپنی تصدیق کی سند عطا کی۔ علامہ شاہ احمد نورانی، علامہ مفتی محمود صاحب، علامہ عبدالحق صاحب، علامہ مصطفیٰ الازہری صاحب، اور دیگر اکابر علماء مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب اور اس دور کے جتنے بھی سیاستدان تھے غوث بخش بنجو، خان عبدالولی خان، ان لوگوں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی اصول پسندی اور ان کے مختی کرادر کے اندر ہم ان لوگوں سے اختلاف نہیں کر سکتے یہ باصول لوگ تھے اور انہوں نے اس دستور کو اپنی سند عطا کی تھی۔ اس دستور کے اندر پہلی ترمیم کی گئی کہ ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہو گا یہ علامہ شاہ احمد نورانی نے کروائی۔ دوسری ترمیم میں مسلمان کی تعریف اور تیسرا ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔ اس دستور کے اندر قرارداد مقاصد اور علماء کے بائیکیں نکات کو بھی شامل کیا گیا۔ اس دستور نے اسلامی نظریاتی کو نسل کا تصور دیا۔ غیاء الحق کے زمانے میں جسٹس ظل الرحمن کی سربراہی میں اسلامی نظریاتی کو نسل بنی لیکن بد قسمتی سے یہ واحد آئینی ادارہ ہے جس کی ایک بھی سفارش پر آج تک عمل نہیں ہوا۔ لیکن یہ بات میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی نظریاتی کو نسل کے فیصلوں

کو پاکستان میں اجماع کی حیثیت حاصل ہے کوئی اس پر اپنے مسلک کی مہر نہیں لگا سکتا۔ اسلامی نظریاتی کو نسل میں آج سیاست اور رشوت کی بنیاد پر بھرتیاں ہوتی ہیں لیکن اگر اہل علم وہاں پر ہوں تو پاکستان کے اندر بہت سارے مسائل کو اسلام کے مطابق حل کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک نظام حکومت کا معاملہ ہے اس بات کو سب مانتے ہیں کہ اسلام بنیادی اصول فراہم کرتا ہے اس میں پچ بھی ہے۔ چاروں خلفاء کے انتخاب میں بنیادی اصول تقویٰ تھا۔ جبکہ طریقہ انتخاب مختلف ہے چنانچہ جب نظام نے سہولت دی ہے تو اس سے فائدہ اٹھائیں اور کفر کا فتویٰ صادر کرنے سے اپنے آپ کو بچائیں۔ ہماری بدقتی یہ ہے کہ آج جمہوریت کے طفیل امریکہ اور یورپ میں فلاہی ریاستیں قائم ہیں مگر اسلام نے جس فلاہی ریاست کا تصور دیا تھا وہ نہ سعودی عرب کے اندر ہے نہ پاکستان کے اندر ہے۔ ایران میں بھی بہت زیادہ غربت ہے مگر وہاں بھیک نہیں مانگی جاتی میں نے میڑوڑیں کے اندر لوگوں کو والکن بجا کر بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ یورپی ممالک میں فلاہی ریاستوں کا تصور موجود ہے اسلام نے گنجائش دی کہ اپنی معاش، معاشرتی ضروریات اور اقدار کو پیش نظر رکھ کر نظام وضع کیا جائے۔ حالات کے مطابق تحریکات کی جاسکتی ہیں۔ آخری بات کروں گا کہ اصول سارے اچھے ہیں جھگڑا صرف نفاذ کا ہے شیعوں کے اصول بھی اچھے ہیں سنیوں کے بھی اچھے ہیں جمہوریت کے بھی اچھے ہیں، اصل مسئلہ عمل درآمد کا ہے دنیا میں دو ہی طبقات ہیں حاکم اور محکوم، ہمیں محکوموں کا ساتھ دینا چاہئے اور ظاموں کے خلاف کھڑا ہونا چاہئے۔

سوالات

محمد عمار۔ متعلم جامعہ نیعیہ

حضرت صاحب نے اپنی نقلگو میں کہا کہ ووٹ شرعی ذمہ داری ہے پاکستان کے اندر جو لوگ ووٹ نہیں دیتے انہیں امیدواروں کی ایمانداری پر شک ہو جاتا ہے کیا ایسا انہیں کرنا چاہئے کی اگران کی نظر میں کوئی امیدوار اہل نہیں ہے تو وہ اپنے ووٹ کو محفوظ رکھیں۔

سوال

قربان علی متعلم دارالعلوم نیعیہ

میر اسوال ڈاکٹر اعجاز احمد صدیقی صاحب سے ہے انہوں نے فرمایا کہ عورت پارلیمنٹ کی
ممبر تو بن سکتی ہے لیکن حکمران نہیں بن سکتی ہمارے ہاں تو وفاقی وزیر اور وزیر اعظم وہی ہو گا جو پار
لیمنٹ کا ممبر ہو گا جب عورت پارلیمنٹ کی ممبر بن سکتی ہے تو پھر وہ حکمران کیوں نہیں بن سکتی اس کی وجہ
ضاحٰت فرمادیں۔

سوال

عبداللہ۔ متعلم جامعہ نیمیہ

میر اسوال بھی ڈاکٹر اعجاز احمد صدیقی صاحب سے ہے آپ بتائیں کہ اسلامی طرز حکمرانی کا
بنیادی ڈھانچہ کیا ہے اور اسلامی طرز حکمرانی اور مغربی طرز حکمرانی میں بنیادی فرق کیا ہے؟ دوسرا
سوال علامہ شاہد صاحب سے ہے کہ جمہوریت کا مطلب ہے عوام کی حکومت عوام کے لئے اور عوام
کے ذریعے، کیا اس تعریف پر پاکستان کی جمہوریت پوری اترتی ہے یا نہیں، کیا ہمارے اکابرین
نے اسی پاکستان کا خواب دیکھا تھا۔

جوابات:

مولانا کاشف شیخ: جامعہ الانصار کراچی

اگر کوئی اہل فرد سامنے نہ ہو تو پھر کیا ووٹ دینا چاہئے؟ میر اخیال ہے کچھ چیزیں اصولی
ہیں اور کچھ ہمارے تجربات میں، ہم دونوں کو الگ الگ رکھیں گے ہمارے آئین میں 62,63 کی
شقیں رکھی گئی ہیں کیا ہمارے امیدوار اس پر پورا ارتتے میں یا نہیں اس اعتبار سے اگر ہم ان
اصولوں اور تجربات کو غلط ملط کر لیں گے تو شاید مسائل بڑھیں گے اور ہم ابہام کا شکار ہوں گے۔
میری رائے یہ ہے کہ اصول تو وہی رہیں گے کہ ووٹ کسے دینا چاہئے البتہ اس کے اندر رہ کر
ووٹ را پناہیں راہیں دیں اسکے لئے استعمال کرے۔

جواب:

مولانا اعجاز حیدر مظہری، ریسرچ سکالر ایز ہرہ اکیڈمی
میں بھی آپ کی طرح ایک طالب علم ہوں ہرجنی کے لئے رسول ہونا ضروری ہے مگر ہرجنی،
رسول نہیں ہوتا۔ وزیر کے لئے پارلیمنٹ کا ممبر ہونا ضروری ہے مگر ہر ممبر وزیر نہیں ہوتا۔

جواب:

ڈاکٹر ابیعاصمدانی، پروفیسر جامعہ دارالعلوم کراچی

اسلامی طرز حکومت کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نظام صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ قائم کرے گی اور امر بالمعروف و نبی عن المنکر کا کام کرے گی۔ ایک اور جگہ کہا گیا کہ عدل و انصاف کا نظام بھی تائیم کرے گئی۔ یہ بنیادی کام ہیں اس کے علاوہ وزارتِ دفاع، وزارتِ خارجہ ہو گی یا نہیں یہ انتظامی معاملات ہیں جو مباحثت کے دائرے میں آتے ہیں اور یہ وقتی ضرورت کے تحت اختیار بھی کئے جاسکتے ہیں اور ضرورت نہ ہونے پر ترک بھی کئے جاسکتے ہیں۔ اسلامی طرز حکومت اور مغربی طرز حکومت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام میں حکمرانی مسؤولیت ہے حق نہیں، ذمہ داری ہے جبکہ مغرب میں اس کو حق سمجھا گیا ہے وزیر کا لفظ وزر سے نکلا ہے جس کے معنی بوجھاٹھانے والا ہیں۔ وزیر اعظم کا مطلب ہے سب سے زیادہ بوجھاٹھانے والا، پھر مغرب لبرل ازم کی طرف چلا جاتا ہے ہم شریعت کے پابند ہیں۔ جہاں تک جمہوریت کی تعریف کا معاملہ ہے اس پر اتنے اعتراضات آئے ہیں کی خود ماہرین نے اس کی تعریف کو ختم کر دیا۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں عوام کی حکومت تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عوام حاکم بھی ہوا و مکوم بھی، ہم کہتے ہیں کہ انھوں نے کچھ لوگوں کو اپنا حاکم بنایا، جب حاکم بنالیا تو پھر لوگ بے دست و پا ہو گئے۔ اب وہ کہتے ہیں ہمارا مقصد ہے کہ عوام کی اکثریت کے فیصلوں کو مدار بنا جائے۔

صدراتی کلمات:

مولانا عبدالحق ہاشمی

مرکزی رہنمای جماعت اسلامی بلوچستان و مشیر و فاقی شرعی عدالت

آج کی محفل میں ایک مشترک بات یہ سامنے آئی کہ ہم اس بات پر تو متفق ہیں کہ پاکستان کا آئین قارون کا خزانہ نہیں بلکہ اگر اسے سنجیدہ طریقے سے زیر بحث لاایا جائے تو اس سے اسلام کے شگوفے پھوٹ سکتے ہیں۔ مولانا آفریدی صاحب نے کہا کہ میں آئین کو اسلامی نہیں کہہ سکتا مگر پھر بھی ان کا مدعایہ تھا کہ اگر یہ نقائص دور کرنے جائیں تو اس آئین کو قبول بھی کیا جاسکتا اور

اس کو قابل عمل بھی بنایا جا سکتا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اصلاحات کی ضرورت ہے دوسرا یہ کہ ہمارے آئین میں جواہپھی چیزیں ہیں ان کو ہم آج تک قابل عمل نہیں بنائے کس کی وجہ یہی ہے کہ ہماری قوت کی جگہ منتشر ہے، میں حوالے کے طور پر بتانا چاہتا ہوں کی ضلع سا ہیوال میں اسی طرح کے مذاکرے میں جانے کا اتفاق ہوا جو جمہوریت اور خلافت کے نظام پر تھا۔ وہاں اپنے وقت کے پانچ خلفاء موجودہ تھے جنہیں اس موجودہ دور میں خلافت کا دعویٰ ہے جب انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ گفتگو کریں تو میں نے کہا کہ پہلے آپ بتادیں کہ مجھے کس کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہے تو میں سمجھوں گا کہ ہمیں اس مجلس کا حاصل مل گیا۔ مولانا صمدانی صاحب تو قابل ملامت نہیں ہیں کہ ان کا امام غائب ہے موجودہ نہیں ہے۔ لیکن ہمارے امام تو غائب نہیں ہیں ہم اسے ڈھونڈہ ہی نہیں پا رہے اس لئے زیادہ بڑے گناہ گار اور مجرم تو ہم خود ہیں۔ اس طرح کے سنبھیڈہ مذاکروں کے نتیجے میں انتشار کی بجائے جو پہلا مرحلہ ہوتا ہے جسے منطقی زبان میں کہتے ہیں کہ پہلے تصور درست ہونا چاہئے۔ کم از کم ہم تصور کی منزل تک تو پہنچیں گے اور جب یہ تصور درست ہوگا تو پھر اگلے مرحلے تک بھی پہنچ جائیں گے۔

مکالمہ دوم

بمقام: لاہور

تاریخ: 19 مئی 2014

شرکائے مذکور

میزبان: محمد عامر رانا صدارت: قاری حنفی جاندھری
سینکڑی جزل و فاق المدارس العربیہ پاکستان و پرنسپل جامعہ خیر المدارس ملتان

شرکائے گفتگو

مولانا نیشن ظفر، پرنسپل جامعہ سلفیہ، فیصل آباد و سینکڑی جزل و فاق المدارس السلفیہ

علامہ شہزاد مجدری، ناظم اعلیٰ دارالاکھاص لاہور

مفتی زاہد حسین، واکس پرنسپل جامعہ امدادیہ فیصل آباد

صاحبزادہ امامت رسول، پرنسپل ادارہ فکر جدید و مدیر ماہنامہ درج بلند

علامہ باقر گلو، جامعہ المفتخر لاہور

دوسری نشست

صدارت: ڈاکٹر راغب نعیمی، پرنسپل جامعہ نعیمیہ لاہور

مرزا الیوب بیگ، تحریک اسلامی لاہور، علامہ یونس قاسمی، مدیر ماہنامہ خلافت، راشدہ فیصل آباد

پروفیسر حافظ خالد، رہنمای ترتیم الاخوان پاکستان، مفتی منصور، کالم نگار، مذہبی سکار

علامہ صادق قریشی، نائب امیر تحریک منہاج القرآن، علامہ عمران خان ناصر، واکس پرنسپل اشریعہ کیڈی گوجرانوالہ

علامہ خلیل الرحمن، مدیر ماہنامہ سوئے چاز

لاہور میں منعقدہ مبارکہ شرکاء



مرزا ایوب بیگ

تحریک اسلامی پاکستان

جمهوریت کو ایک نظام سمجھنا ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ ایک طرز حکومت ہے نہ کہ نظام، جن ممالک میں جمهوریت چل رہی ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ جمهوریت کی جو شکل امریکیہ، یورپ اور ہندوستان میں ہے وہ جیسے اور روں میں نظر نہیں آئے گی، اسی طرح حکومتوں کو بنانے اور گرانے میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کا ایک کردار ہے، کیا امریکہ میں یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داروں کے تعاون کے بغیر کوئی شخص جیت جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام انسانی تاریخ میں استحصال کے حوالے سے ایک بدترین نظام ہے جس کے اوپر جمهوریت کا ریشمی غلاف چڑھادیا گیا ہے تاکہ اس کو نرم و ملائم ظاہر کیا جاسکے۔ جمهوریت کے بعض خصائص بہت اچھے ہیں مثلاً عوام کی رائے، مشورہ، لوگوں کا حق حکومت، مگر اس کے باوجود اصل لوگ سرمایہ دار ہیں جو جمهوریت سے اپنے مفاد اٹھاتے ہیں۔ ماضی قریب میں حتیٰ کہ جنگیں ہوئیں ان کا آغاز سرمایہ داروں نے کیا تاکہ ان کا اربوں ڈالر کا اسلحہ بک سکے۔ پاکستان کی مثال آپ دیکھ لیں یہاں جولوی لٹنڑی جمہوریت ہے اس میں سرمایہ داروں کے بغیر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اشتراکیت کے مقابلے پر جمہوریت نے انسان کو اچھی طرح زندہ ضرور کھا ہوا ہے مثال کے طور پر جہاں جمہوریت ہے وہاں صحت، تعلیم اور روزگار کی سہولیات زیادہ ہیں۔ اشتراکیت نے انسان کو نجٹنے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ تکلاکہ 70 سال میں وہ نظام میں بوس ہو گیا۔ اس کے مقابلے پر سرمایہ دارانہ نظام اپنے گھوڑے کو کھلاتا پلاتا ہے تاکہ بوقت ضرورت اسے سواری کے لئے ایک اچھا گھوڑا میسر ہو سکے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اس حوالے سے کیا کہتا ہے۔ نبی کریمؐ کی جب بعثت ہوئی اس وقت ریاست اور حکومت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دور جاہلیت میں بھی اور اسلامی نظام کے بعد بھی ریاست اور حکومت ایک ہی چیز رہی۔ یہی وجہ تھی کہ جو شخص حکومت کے خلاف بولتا تھا اس کی گردن اڑا دی جاتی تھی کیونکہ ایسا ریاست کے خلاف سمجھا جاتا تھا لیکن اسلام نے ایک ایسا

خوبصورت نظام دیا جس میں امیر المؤمنین کو ایک طرف پرے پورے اختیارات بھی دیئے گئے لیکن دوسری طرف اسے مشاورت کا بھی پابند کر دیا گیا۔ اسلام میں معاشرت کے حوالے سے تفصیلات میں مگر سیاسی نظام کے حوالے سے ایک بنیادی اصول دے دیا گیا کہ آپس میں مشورہ کر لیا کرو، امیر کے چنان و کے حوالے سے باقاعدہ و ونگ کی جائے اس میں کوئی حرخ نہیں ہے نہیں اسلام اس میں کوئی رکاوٹ ڈالتا ہے لیکن امیدوار کے لئے بعض شرائط رکھ دی گئی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ووٹر کے لئے بھی شرائط ہونی چاہئیں کہ وہ ووٹ دینے کا اہل ہے کہ نہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ رہایہ سوال کہ ہمارا آئین میں اسلامی ہے کہ نہیں اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک جملہ بڑا تھا ہے کہ ہمارا آئین مناقف کا پلندہ ہے۔ شق نمبر دو کے مطابق مملکت کا نام ہب اسلامی ہو گا، شق نمبر دو اے کے تحت قرارداد مقاصد آئین کا لازمی جزو ہو گی۔ شق نمبر 32 کے تحت حکومت کا فرض ہے کہ ہر شہری کو اچھا مسلمان بنائے قرآن و حدیث کی تعلیم دی جائے یہاں تک لکھا ہے کہ عربی زبان کی ترویج کا حکومت پورا انتظام کرے گی اس کے علاوہ شق نمبر 227 کے تحت آپ اسلام سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ اس کے باوجود اس آئین میں بعض غیر اسلامی تراجمیں کی گئیں، وہ تراجمیں آج تک موجود ہیں۔

محمد عامر رانا، میزبان

ڈاکٹر کیثر پاک انٹھی ٹیوب فارپیس سٹڈیز

کراچی کے نداکرے میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کا اس بات پر اتفاق تھا کہ اگر اجتماعی داش سے معاملات طے کرنے کا نام جمہوریت ہے تو یہ عین اسلامی ہے۔ پارلیمانی نظام ہتر ہے یا صدارتی، کراچی کے شرکاء کی اکثریت نے صدارتی نظام کو اسلام کے قریب ترین قرار دیا تھا۔ اس حوالے سے بھی اتفاق پایا گیا کہ موجودہ نظام اسلام کے خلاف تو نہیں لیکن اس میں کئی ابہام ہیں جن کو دور کرنا باتی ہے۔ اسی طرح اسلام کی آئینی شقوق پر عمل درآمد کا بھی مسئلہ ہے کہ یہ کیسے ہو گا۔ یہ سوال بھی وہاں موضوع بحث رہا۔ وہاں پر یہ بات بھی ہوئی کہ اگر جمہوریت انتقال اقتدار کا طریقہ ہے نظام نہیں تو طریقہ انتخاب کی نوعیت کیا ہونی چاہئے، ووٹ کون دے گا، صاحب رائے

کون ہوگا، اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ یہ لوگ اپنے حکمران کو منتخب کریں گے۔ ایک اور بات دیکھی گئی کہ پاکستان میں تمام مسائل کو جوڑ کر دیکھا جاتا ہے اگر عام آدمی کے مسائل حل نہیں ہو رہے تو اس کا الزام لازمی طور پر نظام کو جائے گا، جمہوریت یا ملطقة ادارے کو موردا الزام ٹھہرایا جائے گا۔ کیا ہم جمہوریت کو حکومت کے انتظام سے الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں یا نہیں اور ریاست کا انتظامی ڈھانچے کس قسم کا ہونا چاہئے۔ اس میں اتفاق پایا گیا کہ خلیفہ کے انتخاب کے لئے عوام سے رائے لی جاسکتی ہے لیکن پھر یہ سوال آیا کہ صاحب رائے کون ہوگا۔ ایک اور اہم نقطہ کہ اسلام میں عورت شوریٰ کی ممبر بن سکتی ہے۔ اس پر بھی بہت سے شرکاء کا اتفاق تھا، اس بات پر بھی اتفاق تھا کہ علماء کو طے کرنا ہے کہ حکومت کیسے قائم ہوگی غلبے سے یا اتفاق رائے سے، اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق تھا کی زبردستی کرنے کا اختیار کسی طبقے کو نہیں، ہم چاہ رہے ہیں کہ آج کے مذاکرے میں بھی ہم کسی اتفاق رائے کی طرف بڑھ سکیں۔

صاحبزادہ امامت رسول

پرنسپل ادارہ فکر جدید، مدیر ماہنامہ روح بلند

پاکستان کے آئین پر علماء کے نقطہ نظر کے حوالے سے ابہام پایا جاتا ہے، میڈیا علماء کا قطعی ایک مختلف تصور ابھار رہا ہے، اسلام سے قبل بھی حکومت کی انتخابی فردو واحد کے پاس ہوتی تھی اسلام نے بھی آکر اسی سلسلے کو جاری رکھا، رسول اکرمؐ کے بعد خلفاء رشیدین کے دور میں بھی یہی طریقہ رائج رہا۔ دورِ جدید میں بھی نظام چاہے صدارتی ہو یا پارلیمنٹی حتیٰ فیصلہ فردو واحد ہی کرتا ہے۔ فیلی سسٹم میں بھی فیصلے کا اختیار فردو واحد کے پاس ہی ہوتا ہے۔ اسلام نے حکومت کے حوالے سے مشاورت کا تصور دیا ہے، مغربی جمہوریت یہ مشاورت براؤ راست عوام سے کرتی ہے اور ان کی رائے کو ہی حرف آخر تصور کیا جاتا ہے مگر اسلام میں مشاورت قانونِ الہی کے اتباع سے مشروط کردی گئی ہے۔ اگر کوئی رائے اسلام کی تعلیمات کے منانی ہو تو اسے نہیں مانا جائے گا۔ مغرب میں جمہوریت کلی طور پر عوام کے تابع ہے اسلام کہتا ہے کہ اس کا ایک الگ طریقہ کار ہو، کیونکہ پاکستان میں تو خوب یعنی والا اقتدار میں آ جاتا ہے، جو جتنا بڑا فکار ہو اتنا بڑا میدر ہوتا ہے۔

اسلام نے عورت کو سیاسی نظام میں شمولیت کا حق دیا ہے مگر اس کا بنیادی مرکز گھر قرار دیا ہے اور معاشری جدوجہد سے اس کو آزاد قرار دیا ہے۔ اسلام دین نظرت ہے وہ اس علم کی نفع نہیں کرتا جو انسان نے اپنے ارتقاء سے حاصل کیا مگر ساتھ یہ اصول بھی دیتا ہے کہ جو فیصلہ کثرت رائے سے ہو وہ اسلام سے متصادم نہ ہو۔ جہاں تک مذہبی جماعتوں کا معاملہ ہے اگر ملک ہی مسلمانوں کا ہے تو الگ سے مذہبی جماعتوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں بالغ رائے وہی کی بات کی گئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ بلوغت سے زیادہ اہم بات تعلیم اور شعور ہے۔ جس طرح ووٹر کی عمر کا تین ہے اسی طرح اس کو تعلیم سے بھی مشروط کیا جا سکتا ہے، ووٹر کی عمر بھی 18 کی بجائے 30-25 سال مقرر کی جائے، حکمرانوں کی الیت کے معاملے پر بھی قران و سنت سے بہت رہنمائی ملتی ہے جو اخخاری اسے دی جا رہی ہے اس کے لئے اس کا تلقی اور کردار بہت اہم ہے۔

بین الاقوامی تعلقات میں اسلام صلح جوئی کا پیغام دیتا ہے قرآن میں آیا ہے کہ اگر وہ صلح کا پیغام دیں اور ہتھیار رکھ دیں تو تم بھی ان کے پیغام کو قبول کرو، اسلام نے PROXY WARS میں پڑنے کی ممانعت کی ہے۔

اسلام کے معاشری نظام کے حوالے سے عرض ہے کہ اسلام میں ترجیح انسان ہے جبکہ مغربی معاشری نظام میں ترجیح سرمائے کو دی گئی ہے، اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح اسلام کے سیاسی نظام میں اصول سپریم ہے مغرب میں سپریم حیثیت مفاد کو دی گئی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں بھی یہی اصول کا فرمایا ہے اسلام اصول کی بات کرتا ہے مغرب مفاد کو اہمیت دیتا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ جمہوریت میں خامیوں کی نسبت خوبیاں زیادہ ہیں۔ اسلامی دنیا میں بہترین آئین پاکستان کا ہے معاملہ اسلامی یا غیر اسلامی سے زیادہ عمل درآمد اور نیت کا ہے اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آئین کی کوئی شق غیر اسلامی ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ غیر اسلامی نہ ہو مگر اعتراض کسی خاص فقہ کی وجہ سے کیا جا رہا ہو۔ ہاں اگر کوئی شق واقعی اسلام سے متصادم ہو تو اس پر بات ہو سکتی ہے۔

علامہ شہزاد محمد دی

ناظم اعلیٰ دارالاخلاص لاہور

آئین پاکستان کو بناتے وقت علماء نے بہت کام کیا ہری جانشناںی دکھائی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی علماء اس پر ابہام کا شکار نہیں ہیں، بجز چند شقوقوں کے۔ جمہوریت کا جو مقام آج مغرب میں ہے وہ ایک خاص تہذیبی و رسلیٰ کی عکاسی کرتا ہے، جب مغرب جمہوریت کی بات کرتا ہے تو اس کا پس منظر کچھ اور ہوتا ہے۔ ہم لوگوں نے جمہوریت کو ایک نظر یہ نہ روت کے تحت اختیار کیا۔ پاکستان جس عالم میں وجود میں آیا وہ قریب قریب ایک اضطراری حالت تھی، بعد میں 1947 سے 1973 تک کتنے ہی نشیب و فراز آئے۔ جب بطور پاکستانی ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو ہم اسی مشاہدے کے پس منظر میں رہتے ہیں جو ہمیں جمہوری حکمرانوں سے ملا۔ ہم میں سے کوئی شخص صحیح رائے نہیں دے سکتا کیونکہ صحیح جمہوریت اس کے مشاہدے میں آئی ہی نہیں، جو جمہوریت اسے ملی وہ ناقص حیثیت میں تھی۔

اسلام ریاست کے اندر ریاست بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن میں بکثرت ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہے ”فساد فی الارض“۔ اسلام فرد اور معاشرے کی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اسلام نے جانوروں اور نباتات کی حفاظت کی بات بھی کی ہے۔

مفٹی محمد زاہد

وائس پرنسپل جامعہ امدادیہ فیصل آباد

دستور ایک قسم کا عہد ہوتا ہے اسلام عہد کی پاسداری پر بہت زور دیتا ہے۔ میں اس کی مثال اس طرح دوں گا کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کی ذاتی خواہش تھی کہ میرے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پوتے قاسم ابن محمدؓ کو خلیفہ نامزد کیا جائے جو کہ امام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے شاگرد خاص اور ان کے کھیتیجہ بھی تھے اور مدینے کے سات بڑے فقهاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس وقت کے حالات میں یہ ایک بہت اچھا انتخاب ہو سکتا تھا لیکن حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے سلیمان بن عبد الملک کے زمانے میں طے کر دیا گیا تھا کہ عمر بن عبد العزیزؓ کے بعد ولید

بن عبد الملک ہوں گے اس لئے میں کسی طے شدہ عہد کو توڑنا نہیں چاہتا۔ تجویز بڑی آئندہ میل تھی لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ طے شدہ معاملات ہی آگے بڑھائے جائیں۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ کسی نہ کسی لیڈر پر روز کوئی نہ کوئی صاحب آکر قرار داد مقاصد کا ماتم کر رہے ہوتے ہیں یہ طے شدہ چیزوں کے ہٹانے کی باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ دوسری بات میں یہ عرض کرتا چلوں کہ جمہوریت اگر چہ چلی مغرب سے ہے لیکن وہ جہاں جہاں گئی وہاں وہاں کے مقامی اثرات اس نے قبول کئے جس کی مثال میں یہ دیتا ہوں کہ چینی کھانے دنیا بھر میں مقبول ہیں لیکن جو چینی کھانے آپ کو پاکستان میں ملیں گے اس کا ذائقہ چین میں ملنے والے کھانوں سے قطعی مختلف ہو گا، وہ کھانا پاکستان آکر پاکستانی ایڈیشن بن جاتا ہے۔ اسی طرح مغربی جمہوریت ہے، اس کا تعلق مغرب سے ہے مگر اب وہ پاکستانی بھی ہے، ہندوستانی بھی ہے، افغانی بھی ہے، ملاشین بھی ہے، ایرانی بھی ہے۔ اس وقت بلا مبالغہ مغربی تہذیب بالادست ہے۔ بعض اوقات جو سائل مغربی تہذیب کی بالادستی کی صورت میں پیدا ہو رہے ہیں ہم ان کو جمہوریت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ ہاں اگر کسی جگہ کا سماج یہ سب کچھ درکرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو پھر بات دوسری ہے جیسا کہ خیلی ممالک ہیں وہاں کافیل کا کردار عالمی لیبرتوں میں سے مطابقت نہیں رکھتا مگر چونکہ ان کے پاس وسائل ہیں وہ دنیا کے مقابلے پر کھڑے ہو سکتے ہیں اس لئے ان کے اپنے معیار ہیں، اس لئے وہاں جمہوریت بھی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہمیں مقاصد شریعت کا تعین کرنا ہو گا اور پھر طے کرنا ہو گا۔ جس جگہ آج جمہوریت کھڑی ہے اس سے یہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ میں ایک ادارے ڈیموکریسی انتہائیں کی روپورٹ دیکھ رہا تھا انھوں نے جمہوریت کے سات اجزاء ترکیبی بیان کئے ہیں پھر تو بیان آف پاور ہے، یقیناً یہ مقاصد شریعت کے عین مطابق ہے اس سے مطلق العنانیت کا خاتمه ہوتا ہے، اسی طریقے سے عدیہ کی آزادی کا معیار ہے۔ اس لئے جب ہم یہاں pluralism کی بات کریں گے تو وہ اس نوعیت کا نہیں ہو گا بلکہ وہ پاکستانی ڈھانچے کے اندر ہو گا۔ ہم آج یہاں جتنے بھی لوگ بیٹھے ہیں وہ کسی نہ کسی ادارے یا تنظیم سے وابستہ ہیں۔ یہ سب بھی جمہوریت کا ہی شر ہے ورنہ آپ سعودی عرب میں بیٹھ کر اس طرح آزادی سے گفتگو نہیں کر سکتے۔

اسی طرح سے چوتھے نمبر پر قانون کی حکمرانی کا دم بھرنا ہے۔ پانچویں نمبر پر احتساب اور شفافیت ہے۔ چھٹے نمبر پر متنوع، آزاد اور خود مختار میدیا یا ہے۔ ساتویں نمبر پر انسانی اور سیاسی حقوق کی عملداری ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ جمہوریت کے جوازائے تزکیبی آج میں اس کو ہمیں دیکھنا چاہئے اور موازنہ کرنا چاہئے۔ جمہوریت میں بھی بہت ساری خامیاں ہیں۔ اللہ کی طرف سے حکومت کا کوئی نظام نہیں دیا گیا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ خلافے راشدین میں سے بھی ہر ایک کا طریقہ انتخاب الگ ہے جو دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا معاشرہ بیدار اور باشعور ہو تو شریعت کے مقاصد کسی اور نظام کی بجائے جمہوریت کے ذریعے زیادہ بہتر طور پر پورے ہو سکتے ہیں۔

علامہ غلام باقر گلو[ؒ] معلم جامعہ المنظر لاہور

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک اور عوام کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے بہترین راستہ ہے، خلافے راشدین اور عامتہ اہل بیت کے ادوار میں بھی عوام کی فلاح اور انصاف کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ نجح البلاغہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مختلف خطوط اپنے دور حکومت کے منتظمین کو لکھے ہیں ان میں سے ایک مالکِ اشتہر ہیں یا مختلف شہروں کے گورنزوں کو لکھے ہیں۔ سب سے پہلی چیز ہمیں تقویٰ الہی ملتی ہے اس کے بعد حقوق انس اور انصاف کا تذکرہ ہے اور یہ بات ہر کوئی چاہتا ہے کہ جو بھی مندرجہ حکومت پر بیٹھے وہ ان فرائض کو متوظ خاطر رکھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آئین پاکستان کو بنانے کی جدوجہد میں ہر ملک کے جید علمائے کرام شامل رہے ہیں اس لئے اس میں کوئی ایسا جزو نہیں ہے جو غیر اسلامی ہو، مسئلہ آئین میں کسی کی کاہنیں بلکہ عمل درآمد کا ہے، اس ملک کے بہت سے مسائل جو شدید سے شدید تر ہو رہے ہیں اس کی وجہ نظر یہ ہے کہ قوانین پر عمل نہیں کیا جا رہا۔ جیسا کہ قانون قصاص ہے جس پر عمل نہیں کیا جا رہا، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جمہوری طریقے سے اگر قوانین پر عمل درآمد ہو تو عوام کی بھلاکی ہوگی اور ملک آگے بڑھے گا۔

مولانا نیشن خفر

جزل سیکرٹری وفاق المدارس السلفیہ

اسلام کے نظام حکومت، سیاست، خلافت پر بہت کتنا میں لکھی گئی ہیں۔ اسلامی ریاست و حکومت کا تصور موجود ہے اور اسی کے پیش نظر خلافے راشدین کی حکومتیں وجود میں آئی ہیں اور وہ چار طریقے ہیں جنہیں ہم منہاج النبوی کہتے ہیں۔ اگر حکومت کا مقصد شریعت کی ترویج ہو تو خواہ وہ پاریمانی ہو یا صدارتی کوئی حرج والی بات نہیں۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے کہ اسے ہم اسلامی کہیں یا غیر اسلامی کہیں، ہم کوئی بھی چیز دیے ہیں قبول نہیں کرتے بلکہ اس کے مضمرات اور فوائد کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہی حال جمہوریت کا ہے اگر اس کے فوائد ہیں تو پھر اس سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مغرب میں تو اکثریت جو بھی فیصلہ کر لے اس کو قبول کر لیا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں چونکہ حاکم اعلیٰ اللہ ہے جو قوانین اور حقوق بیان کر دیئے گئے اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی وہ اسی طرح سے نافذ اعمال ہیں۔ البتہ میں یہ عرض ضرور کروں گا کہ حق رائے دہی پر غور کرنا چاہئے کیونکہ اسلام نے پڑھے لکھے اور ان پڑھ کے درمیان فرق کیا ہے اور اس کا ذکر قرآن کریم میں کئی جگہوں پر متعدد شکلوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لئے رائے دہندگان کی کچھ شراط ہونی چاہئیں۔ یہاں پہلے بھی کہا گیا اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ محض عمر کا اصول نہیں ہونا چاہئے 18 سال کی عمر میں ایک بچے میں فیصلہ کرنے کی جتنی صلاحیت ہوتی ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس فیصلے کو اس کے والدین بھی قبول کرتے ہوں چ جائیکہ کہ حکومت سازی میں ان کی رائے کو اتنا اہمیت دے دی جائے۔ اس لئے رائے دہندگان کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ عمر کی حد بھی بڑھادی جائے تو بہتری آسکتی ہے۔ بیرونی دنیا میں اکثریت کی بنیاد پر قانون سازی ہوتی ہے جبکہ ہم قرآن و سنت کی اساس کو مخوذ خاطر کر کر ہم قانون سازی کر سکتے ہیں۔ ہم جمہوریت کو مادر پدر آزاد نہیں چھوڑ سکتے جیسا کہ مغرب کے اندر ہے البتہ جہاں ضرورت ہو وہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کے لئے اہل علم نے جو شرائط متعین کیں ان کا پاس رکھا جائے تو ٹھیک ہے۔ انتظامی امور میں بہتری کے لئے حکومت کو قانون سازی کا حق دیا گیا ہے جیسے کہ ٹریک کے یا اس نوعیت کے دیگر مسائل ہیں۔ تیسرا سوال کہ حکومت بنانے میں عوای رائے کا

احترام کس حد تک ہے آپ سب کے علم میں ہے کہ سیدنا عثمانؑ کا جب انتخاب ہوا تو حضرت عبد الرحمن ابن عوفؓ نے مدینہ منورہ میں گھر گھر جا کر دروازے کھٹکھٹا کر رائے طلب کی اور اسی کی روشنی میں فیصلہ صادر فرمایا۔ بعض اہل علم یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے مغض مددوں سے نہیں بلکہ عورتوں سے بھی رائے لی تھی۔ چوتھی بات شوریٰ کی ہے جو بلاشبہ اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے اسلام میں مشورہ طلب کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہے کہ آپ پہلے سے معین کردہ لوگوں سے ہی رائے طلب کریں، حاکم وقت جس سے چاہے مشورہ لے سکتا ہے، اور اگر مشورہ صائب ہو تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ مشورہ مددوں سے نہیں عورتوں سے بھی لیا جاسکتا ہے۔

سوالات

آصف، طالب علم جامعہ نجیمیہ

بعض علماء کرام نے کہا کہ جمہوریت بہترین نظام حکومت ہے، تو پھر خلافے راشدین کا دورِ حنفیں ہم بہترین گردانے ہیں ان کو کہاں رکھیں گے؟

جواب:

مفتي محمد زاہد حسین، پرنسپل ادارہ فکرِ جدید و مدنی ماہنامہ روح بلند ہم میں سے کسی نے نہیں کہا کہ ہمارا موجودہ نظام بالکل اسلام کے مطابق ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا گیا ہے کہ اسلام کے خلاف نہیں ہے یا یہ کہ اس کو اسلام کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔ جہاں تک آپ نے قرون اولیٰ کی بات کی اس حوالے سے میں نے یہ کہا تھا کہ قرآن و حدیث کو سامنے رکھ کر ہمیں مقاصدِ معین کرنے چاہئیں کہ اس شعبے میں شریعت چاہتی کیا ہے اور پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ ہم کس سسٹم کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں خلافے راشدین کے دور میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہ نہیں کہ لوگوں کو حق تھا کہ وہ لوگوں پر تنقید کریں بلکہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبوں میں ارشاد فرمایا کہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ حکومت پر نظر رکھیں۔ اب ملوکیت کے جو ادوار ہماری تاریخ میں رہے ہیں چاہے مغلیہ ہو یا اس سے پہلے ترکوں کا، عباسیوں کا یا عمیویوں کا، اس میں اس مقصد کے حصول کی

کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ذاتی طور پر اگر کوئی بادشاہ یا گیا تو اس نے تنقید کو گوارا کر لیا، لیکن باقاں نہ تنقید یا مگر ان کا کوئی سسٹم موجود نہیں تھا۔ میں نے یہ بات کی تھی کہ یہ ہم جمہوری سسٹم کے ذریعے حاصل کر سکتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوریت میں بھی نا انصافیاں ہوتی ہیں لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ کم روضرو لیتا ہے اس کو رو نے کا حق ضرور مل جاتا ہے جہاں جمہوریت نہیں ہوتی وہاں وہ رو بھی نہیں سکتا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ پہلے ہمیں مقاصد شریعت متعین کرنے چاہیں اور پھر بطور ذریعہ نظام حکومت کا تعین کرنا چاہئے کیونکہ ذریعہ اللہ تعالیٰ نے متعین نہیں کیا بطور ذریعہ کون سانظام حکومت ہم لیں گے یہ میں دیکھنا چاہئے۔

سوال، راشد محمود، متعلم جامعہ نعیمیہ

مرزا ایوب صاحب نے فرمایا کہ 1973 کا آئین مناقفتوں کا پلندہ ہے میں اس کی وضاحت چاہوں گا کیونکہ یہ آئین اس وقت کے جید علماء نے مرتب کیا، اہم بات یہ کہ مجرپاریہنٹ کی امیت کا تعین آئین کی شق 62 اور 63 کے تحت نہیں ہوتا، اسی طرح اسلامی نظریاتی کو نسل کا آئین میں اہم کردار ہو سکتا ہے مگر وہ اس وقت ہو گا جب ممبر ان کی تعیناتی میرٹ اور معیار پر ہوگی، اس حوالے سے روشنی ڈالیں؟

جواب،

مرزا ایوب، رہنماء تحریک اسلامی

اس میں کوئی شک نہیں کہ آئین سازی میں اس وقت کے جید علماء شامل تھے جنہوں نے آئین پر اپنی مہر ثبت کی تھی جس کے عوض ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ دس سال کے اندر آئین کی تمام شقوق کو اسلامی کر دیا جائے گا، جیسے سود کا معاملہ، وہ وعدہ تو محظوظ کے وعدے کی طرح ہو گیا۔

سوال:

خالد اقبال، متعلم جامعہ نعیمیہ

علمائے کرام نے فرمایا کہ ہمارے آئین میں جو کی ہے اس کو ہم اسلامی نظریاتی کو نسل کے پلیٹ فارم سے پورا کر سکتے ہیں، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اسلامی نظریاتی کو نسل کی اسلامی قوانین کے لحاظ سے ہزاروں سفارشات ہیں مگر وہ صرف ردی کی ٹوکری بنی ہوئی ہیں، اب ہم ان کو کیسے

ارباب اختیار کو یادداشتے ہیں یا قانون کو اسلامی بناسکتے ہیں؟

جواب:

مفتی محمد زاہد، وائس پرنسپل جامعہ امدادیہ فیصل آباد

یہ مسئلہ ہمارے ہاں عدالتوں میں بھی زیر بحث رہا، اگرچہ عدالتوں نے بعض اچھے فیصلے بھی دیئے مگر حاکم خان کیس میں یہ معاملہ دوسری طرف چلا گیا۔ کسی بھی وقت اس پر دوبارہ غور ہو سکتا ہے۔ ظفر علی شاہ کیس میں پاکستان کے آئین کی چار خصوصیات طے کردی گئیں کہ یہ وفاقی اور پارلیمانی کے ساتھ اسلامی ہوگا۔ اسلامی شقوق کی سپریتی کو ضمنی طور پر ہی سہی تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن جب تک عدالت واضح فیصلہ نہیں دیتی کہ آرٹیکل A-2 باقی شقوق پر بالاتر ہے تو تک مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ اس آرٹیکل کی بیڑی نکال کر اس کو دوسری ڈیاؤس کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے کہ اب یہاں کی بیڑی سے چلے گی۔ اسی طرح آرٹیکل 45 جس کے تحت صدر مملکت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی قاتل کی سزا معاون کر سکتے ہیں بھی متنازع ہے۔ اگر سماج چاہے تو دباو ڈال کر اس کو معطل کرو سکتا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی کیا گیا کہ کیا حدود جیسے مسئلے پر بھی مقاصد شریعت پیش رکھے جاسکتے ہیں؟ ایسا نہیں ہے منصوصات کو کسی صورت ترک نہیں کیا جاسکتا ہاں البتہ جن پر واضح احکام نہیں ان کو کسی قومی مصلحت کے تحت موخر کیا جاسکتا ہے جیسے کہ حضرت عمرؓ نے بعض موقع پر کیا۔ لیکن جو منصوص احکام ہیں یا جن پر امت کا اجماع موجود ہے تو ان پر کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ کم از کم اہل سنت کے تمام مکاتب ملک کا اتفاق رائے ہے کہ اگر کسی مسئلے پر اجتہادات مختلف ہوں تو ولایت الامر کو یقین حاصل ہے کہ وہ کسی ایک رائے کو لے کر نافذ کر دیں، اگرچہ اہل علم بحث پھر بھی جاری رکھیں گے، ولایت الامر نے جس رائے کو اختیار کیا ہے اس کے خلاف بھی رائے دیتے رہیں گے اور بحث جاری رہے گی، لیکن بحث جاری رکھنے کی اجازت بھی جمہوریت ہی دے گی۔

سوال:

محمد جنید، معلم جامعہ نعیمیہ

میر اسوال یہ ہے کہ کیا موجودہ جمہوریت عوام کے بنیادی حقوق کو پورا کرنے میں کامیاب

ہے، اگر نہیں ہے تو کیا اس کوڑی ریل کیا جا سکتا ہے، اسلامی رو سے اگر اس کوڑی ریل نہیں کیا جا سکتا تو اس کی اصلاح کی صورت کون سی ہو گی؟

جواب

علامہ شہزاد مجددی، ناظم اعلیٰ دارالا خلاص لاہور

ہم جمہوریت کا پاکستانی ایڈیشن دیکھ رہے ہیں، پاکستان میں جمہوریت کے باوجود جو ظلم و ستم، جبرا و استبداد اور استھصال روا رکھا جا رہا ہے اس میں نکوئی عذر ہے، نہ خوف ہے نہ معذرت ہے۔ جمہوریت کے نام پر دن دیہاڑ لے لوٹ مار ہو رہی ہے۔ ہماری شریعت تو کہتی ہے کہ کم از کم گناہ کو گناہ سمجھ کر تو کرو۔ اگر گناہ کو ثواب سمجھ کر کرنا شروع کر دیا تو پھر معاملہ اللہ ہو جائے گا میں تو دیکھ رہا ہوں کہ ہم جمہوریت کو اسلام کا البادہ اوڑھا کر اپنے ظلم، جبرا و استھصال کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ بہر حال اس وقت وہ ثمرات بہر حال نہیں مل رہے جو جمہوریت کے خلقین کے پیش نظر تھے یا جہاں سے یہ سسٹم آیا ہے۔ ہم از کم وہی جمہوریت اختیار کر لیں تو بھی یہ اسلام کے قریب ترین کوئی نظام ہو گا۔ پولیس کی یونیفارم میں اگر کوئی جرم ہو رہا ہے تو قصور وار یونیفارم کو قرار نہیں دیا جا سکتا اسی طرح جمہوریت کی یونیفارم میں جو ظلم و ستم ہو رہا ہے وہ کسی طور قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

سوال:

خالد محمود متعلم جامعہ نیعیہ

علامہ باقر صاحب نے کہا ہے کہ ہمارا آئین مکمل اسلامی ہے جبکہ بعض نے کہا کہ اس میں کئی ایسے مسائل ہیں جو اسلام سے نکراوہ کے متراوہ ہیں جیسے حدود اللہ کا نفاذ، دوسرا شادی کے لئے پہلی بیوی سے اجازت اور دیگر مسائل کو دیکھتے ہوئے کیا ہم اس آئین کو اسلامی کہہ سکتے ہیں اگر نہیں تو آئین کو کیسے اسلامی بنایا جا سکتا ہے؟

جواب:

علامہ باقر گلو، جامعہ لمبیث لمشتر لاہور

میں نے عرض کی تھی کہ یہ ہمارے بزرگ اور جید علماء کی نگرانی میں بنایا گیا تھا اس میں

اگرچہ کچھ مناقشات ہیں مگر اسلامی نظریاتی کو نسل کے ذریعے انھیں حل کیا جاسکتا ہے۔ بعض مسائل ایسے ہیں جو مسائل کی بنیاد پر ہیں ان کو حل کیا جانا چاہئے۔ جیسے تعریفی مسائل ہیں لیکن بعض ایسے مسائل ہیں جن کا تعین نہیں ہے ان کو مفسدہ کی بنیاد پر کہ مسئلہ کتنا شدید، ضعف یا متوسط ہے یا جیسے کہ حرامت ہیں، حرام بھی فعل اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس میں مفسدہ شدید ہوا گر اس میں مفسدہ شدید نہیں ہے ضعف ہے تو وہ حرام کی نوبت نہیں پہنچتا بلکہ اسے ہم مکروہ کہتے ہیں۔ اس طرح واجبات میں مصلحت شدید ہو تو وہ فعل ملزم ہو جاتا ہے۔ تعریفات میں بھی اس طرح کچھ احکامات ہیں کہ قاضی اس فعل کے انجام دینے والے کو اس کی تشخیص کے مطابق سزا دے سکتا ہے۔ اس طرح آئین میں جو اشکال ہیں وہ قبل حل ہیں اسلامی نظریاتی کو نسل انہی مسائل کے ازالے کے لئے قائم کی گئی ہے شرط یہ ہے کہ اس کے اراکین کی تقریبی سیاسی بنیادوں کی بجائے اسلامی بنیادوں پر کی جائے۔

خطبہ صدارت

قاری حنیف جالندھری

سیکٹری جنرل وفاق المدارس العربیہ و پرنسپل جامعہ خیر المدارس ملتان
ملوکیت، شخصیت اور جمہوریت دو مختلف بلکہ متفاہ اصطلاحات ہیں میری ناچیز رائے میں
ملوکیت اور جمہوریت کے افراط و تغیریات کے درمیان جو توسط و اعتدال ہے اسلامی نظریاتی حکومت
و ریاست اسی توسط و اعتدال پر استوار ہوئی ہے جسے شرعی اصطلاح میں شورائیت کا نام دیا گیا ہے۔
ایک صحیح اسلامی ریاست میں نہ تباہ شاہت ہو سکتی ہے نہ آمریت، اور نہ ہی ایسی جمہوریت جو
صرف حاکمیت عوام کے نظر میں پرمنی اور قائم ہو بلکہ صرف وہی ریاست حقیقت میں اسلامی ہو سکتی
ہے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی شریعت کو قانون برقرار
اولین ماذوق این مانے اور حدود اللہ کے اندر رہ کر کام کرنے کی پابند ہو اس ریاست میں اقتدار
اعلیٰ کی اصل غرض اللہ تعالیٰ کے احکامات کا اجراء اور اس کی رضا کے مطابق برائیوں کا استھصال اور
بھلائی کا ارتقاء ہے۔ اس ریاست کا اقتدار اعلیٰ، اقتدار اعلیٰ نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت اور

امانت ہوتا ہے آپ اہل علم جانتے ہیں کہ قرارداد مقاصد میں بھی یہی بات اصولی طور پر طے کر دی گئی ہے کہ پاکستان کی اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات ہو گی قران و سنت، قانون سازی کے بنیادی ماذ ہوں گے اور عوام کے نمائندے اپنے اختیارات کو اللہ تعالیٰ کے نائب اور مخلوم کی حیثیت سے استعمال کر سکیں گے یہ قرارداد مقاصد کئی عشروں تک دستور کے دیباچے کی حیثیت سے غیر موثر اور نمائشی حیثیت میں رہی اب الحمد للہ یہ دستور کا قابل عمل حصہ بن چکی ہے۔ جس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت کا مفہوم مغرب کی سیکولر جمہوریت کے تصور سے مختلف ہے۔ مغربی جمہوریت میں حاکیتِ اعلیٰ منتخب نمائندوں کو حاصل ہوتی ہے انہی کی رائے سے قوانین بنتے ہیں اور انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ جس قانون کو وہ چاہیں نافذ کریں اور جس کو چاہیں کتاب آئین میں مجوہ دیں۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے اسلام میں بالآخر بنیادی قانون خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے دیتے ہیں جس کی اطاعت ریاست اور قوم دونوں کو کرنی پڑتی ہے۔ بالفاظ دیگر اسلامی جمہوریت یا اسلامی ریاست میں اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو محدود حاکیت دی گئی ہے۔ اس محدود حاکیت میں انتظامیہ اور مقتضیہ مسلمانوں کی رائے سے ہی بنیں گے اور مسلمان ہی اسے معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور وہ تمام مسائل جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے وہ مسلمانوں کے اجماع سے ہی طے ہوں گے۔ لیکن جہاں اللہ اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو وہاں مسلمانوں کے کسی امیر، کسی مقتضیہ، کسی مذہبی شخصیت بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس میں ترمیم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جب اسلام کے اس حکم کو بیان کیا جاتا ہے کہ نصوص و قطعیات میں کسی کوتر میم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تو بعض حلقة اسے تھیو کر لیں، مذہبی حکومت بنا پا پا بیت یا آج کل کی اصطلاح میں مولویوں کی حکومت کا نام دے کر محقق کرتے ہیں۔ مغربی تعلیم یافتہ حضرات جن کے اذہان میں مغربی اصطلاحات کے استعمال کی وجہ سے مغربی تصورات ہوتے ہیں وہ مذہبی حکومت کا بھی مطلب سمجھتے ہیں کہ جس طرح یورپ میں ایک وقت میں مذہبی پیشواؤں اور پادریوں نے خدا کا نمائندہ اور ترجمان بن کر قانون سازی اور اس کی تفصیل کا منصب اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اسی طرح پاکستان میں مذہبی حکومت قائم

ہونے سے قانون سازی اور اس کی تشریع کے تمام اختیارات مذہبی شخصیات یعنی مولویوں کے پاس چل جائیں گے۔ یہ غلط فہمی ایک بہت بڑی حقیقت کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ انجیل کی اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی قانونی ہدایت نامہ چھوڑ کر نہیں گئے چنانچہ جب عیساً یوں کو اپنے معاملات، سیاسیات، معاشیات وغیرہ میں قوانین و احکامات کی ضرورت پیش آئی تو ان کے مذہبی پیشواؤں نے اس ضرورت کو خود اپنے احکامات سے پورا کر لیا اور ان احکامات کو خدائی احکامات کی حیثیت سے منوایا۔ جبکہ مسلمانوں کے پاس قرآن کریم اپنے جامع اور وسیع احکامات کی صورت میں موجود ہے اس کی تشریع کے لئے جناب نبی کریمؐ کی قول اور عملی ہدایات کامل اور محفوظ شکل میں آج تک موجود ہیں۔ اختلافی مسائل میں اجماع امت اور مجتہدین کے فیصلے موجود ہیں ان سب کے ہوتے ہوئے کسی شخص کے قول و فعل کو حکم خداوندی کی حیثیت سے بے چون و چاراں لیا جائے یہ مسلم اور اسلامی معاشرے میں ناممکنات میں سے ہے۔ اس صریح فرق کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت یا تھیو کریمی کہنا قطعاً غلط ہوگا۔ یہاں یہ بات یاد دہانی کی صورت میں عرض کرتا ہوں۔ میں نے آپ کی گفتگو سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ تھیو کریمی کا مطلب خدا کی حکومت ہے یہ اپنے بنیادی تصور کے اعتبار سے بڑی ہی آئینہ میں اور شاندار چیز ہے لیکن جب تھیو کریمی کے نام پر مذہبی پیشواؤں کی حکومت قائم کر دی گئی تو اس کی حیثیت لوگوں کی نظر وہ سے او جھل ہو گئی۔ ڈیموکریتی جس کو آپ عوام کی حاکمیت کہتے ہیں تھیو کریمی کے مقابلے پر وجود میں آئی۔ پونکہ تھیو کریمی کا استعمال غلط ہوا تھا اس لئے عوام کی حاکمیت کے نام پر جمہوریت کا جو تصور ابھرا یہ ایک رد عمل تھا اور آپ جانتے ہیں کہ رد عمل میں اعتدال نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ڈیموکریتی اپنے تاریخی لپس منظر میں ایک رد عمل کا نام ہے دنیا میں جہاں بھی جمہوریت ہے اس کی چند اچھی باتوں کے باوجود کیا وہاں حقیقی معنوں میں عوام کی حاکمیت ہوتی ہے یا صحیح معنوں میں عوام کی رائے سے فیصلے ہوتے ہیں۔ پاکستان میں ہی دیکھ لیں آج کہا جا رہا کہ عوام کا مینڈیٹ چوری ہوا ہے ایسی صورتحال میں عوام کی حاکمیت ایک خوشمناظر ضرور ہے مگر اس کی حقیقت نہیں۔ جمہوریت کے دو بنیادی اصول ہیں۔

ایک عوام کی سیاسی و قانونی حاکمیت جو عوام کی اکثریت کے ذریعے ظہور میں آئے
دوم۔ ریاست کا انتظام کرنے والی حکومت کا عوام کی آزادانہ خواہش پر بننا اور تبدیل
ہونا۔

اسلام اس جمہوریت کے صرف دوسرے حصے کو لیتا ہے یعنی ریاست کا انتظام کرنے والی
حکومت عوام کی رائے پا مشورے سے وجود میں آئے اور عوام کی تائید سے محروم ہونے کی صورت
میں تبدیل ہو جائے۔ جمہوریت کے پہلے اصول کو اسلامی نقطہ نظر سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا
ہے۔ اسلام قانون حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کرتا ہے جس کے احکامات خواہ کتاب اللہ
میں ہوں یا سنت رسول اللہ میں، ریاست کے لئے ناقابل تغیر و تبدل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں
جبکہ سیاسی حاکمیت کو اسلام حاکمیت کی بجائے خلافت یعنی اللہ تعالیٰ حاکم اعلیٰ کی نیابت قرار دے کر
ریاست کے عام مسلمان باشندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ خلافت عوام کی اکثریت یا ان کے
معتمد الیہ نمائندوں کی اکثریت کے ذریعے عملًا ظہور میں آئی ہے۔ اس نمایادی فرق کو دیکھتے
ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوریت یا ڈیموکریسی کہنا بھی کسی طرح
درست نہیں۔ اسلام کے شورائی نظام اور مغربی جمہوریت میں باہمی اختلافِ رائے کے وقت
فیصلہ کثرتِ رائے کے تابع ہوتا ہے۔ کثرتِ رائے کے مقابلے میں نہ امیر کی کوئی حیثیت ہے نہ
کسی دوسرے اہل رائے اور تجربہ کار لوگوں کی جن کے متعلق کہا جاتا ہے یہاں لوگوں کو گناہ کرتے
ہیں تو لا نہیں جاتا۔

دوسری ایشن

صدرات: ڈاکٹر راغب نجمی
پرنسپل جامعہ نیعیہ لاہور

علامہ یوسف قاسمی
مدیر ماہنامہ خلافت راشدہ فیصل آباد
ہمارے ہاں جب جمہوریت کی بات کی جاتی ہے تو اکثر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ جمہوریت

اسلام کے دیے ہوئے تصور یا ست میں مختلف کوئی نظام ہے۔ شاید اسی وجہ سے اکثر و پیشتر اسلام کا مقابل جمہوریت کے ساتھ کیا جاتا ہے، کیونکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ خلافت اور جمہوریت دو بالکل مختلف تصورات اور دو مختلف فکرروں کے داعی ہیں۔ میری رائے میں اسلام اور جمہوریت کا کوئی مقابل نہیں بنتا، کیونکہ اسلام کا مقابل عیسائیت، یہودیت، ہندو مت اور بدھ مت سے تو کر سکتے ہیں، جمہوریت سے نہیں، کیوں کہ اسلام ایک دین و مذہب ہے، اس کا مقابل کسی اور دین و مذہب کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ جبکہ جمہوریت کوئی مذہب یاد دین نہیں، بلکہ محض حکومت چلانے کا ایک طریقہ کار ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اسلام کا تصور یا ست جمہوریت کے تصور یا ست سے بالکل مختلف ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں پاکستان جیسے ملک میں خلافت کا نظام نافذ کرنے کے لیے ایک پورے نظام کو لپیٹنا پڑے گا۔ ایک نظام کو گرا کر دوسرا نے نظام کو نافذ کرنے کے عمل کو دنیا کی تمام سیاسی لغات میں انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ہم اسلام کے تصور یا ست یعنی نظام خلافت کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو یہاں جمہوریت کا تختہ الثنا پڑے گا۔ اس صورت حال میں سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان اس انقلاب کا متحمل ہو سکتا ہے؟ پاکستان جن معاشی و معاشری مسائل سے دوچار ہے یہاں تقسیم دریں کی جو صورت حال ہے، جس طبقاتی نظام کا ہمیں سامنا ہے، جہاں فرقہ و رانہ بنیادوں پر سیاسی تقسیم ہے اور انسانیت، صوبائیت و عصیت کی بنیاد پر حکومتیں بنتی ہیں۔ ایسے حالات سے گزرنے والے ملک میں انقلاب کی باتوں سے خون خراپ تو ہو سکتا ہے کسی نظام کو اٹا نہیں جاسکتا۔

میرے خیال میں اس بات کا بہت گہرائی کے ساتھ مطالعہ اور بڑے شرح صدر کے ساتھ اس کا تجزیہ کیا جانا چاہیے کہ کیا واقعی جمہوریت خلافت سے متصادم ہے اور ہے تو کس قدر؟ یہ بات جو بڑی شدومد کے ساتھ کی جاتی ہے کہ خلافت ایک شورائی نظام ہے۔ میرے خیال میں جمہوریت بھی شورائی نظام ہے اور یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں ہر آدمی کو اس بات کا حق دیا گیا ہے کہ وہ مجلس شوریٰ کے لیے اپنے نمائندے کا انتخاب کرے۔ ان نمائندوں سے بننے والی مجلس شوریٰ کو جو سب سے پہلے ذمہ داری سونپی جاتی ہے وہ ریاست میں اپنے امیر (سربراہ حکومت) کا انتخاب

کرنا ہوتا ہے۔ خلافت نے جو طریق ہائے انتخاب متعارف کروائے ہیں ان میں سے قریب قریب ایک یہ بھی ہے۔ تصویر کے دونوں رخ ایک جیسے ہیں فرق صرف اصطلاحات کا ہے۔ ہمارے ہاں جو ریاستی سطح پر خرابیاں پائی جاتی ہیں ان کی ذمہ دار جمہوریت نہیں بلکہ اس کا ذمہ دار ہمارا معاشرہ ہے جو نہ صرف یہ کہ پڑھے بلکہ فکری اور اخلاقی اخبطاط کا بھی شکار ہے۔ ورنہ یہی جمہوریت فرانس، برطانیہ اور امریکا میں بھی تو ہے جہاں بہت ساری چیزوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اس قدر نظری عملی خرابیاں نہیں جس قدر ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں۔

میرے خیال میں ہمیں جمہوریت کو بالکل روئیں کرنا چاہئے کیونکہ میرا یقین ہے کہ جمہوریت کی بحث اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہوتی جب تک خلافت راشدہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ سولہویں اور اٹھارہویں صدی میں جمہوریت کے علم برداروں نے شہریوں کو جو حقوق فراہم کیے، دین اسلام ان سے کئی صدیاں قبل وہ حقوق فراہم کر چکا تھا۔ امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق ععظم یہ حقوق اپنی ریاست کے شہریوں کو انقلاب فرانس سے صدیاں پیشتر ہی دے چکے تھے۔ مغرب نے اٹھارہویں صدی میں یہ چاہا کہ قانون کی نظر میں بادشاہ اور شہری کا درجہ برابر ہو، بلکہ اس کا عملی مظاہرہ صدیوں پہلے اسلام کر چکا تھا۔ اہل مغرب نے حکمرانوں کے احتساب، آزادی اظہار اور عدالت کی آزادی کی تحریکات سولہویں صدی میں شروع کیں جبکہ آج سے چودہ سو سال پہلے خلافت راشدہ کے دور میں یہ سب کچھ موجود تھا، عدالتی آزاد تھی، جس کے سامنے خلیفہ وقت بھی عام شہری کی طرح پیش ہونے کا پابند تھا، حکمرانوں کا احتساب بھری محفل اور برس منبر کیا جاتا تھا، آزادی اظہار کی اتنی اجازت تھی کہ خود حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کرام نے مشورہ اور حکم میں فرق معلوم کرتے تھے اور مشورہ ہونے کی صورت میں عمل نہ کرنے میں آزاد ہوتے تھے۔ سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغرب کو جمہوریت اور جمہور کے حقوق کا خیال اسلام کے بعد ہی آیا ہے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جمہوریت ہماری ہی گم شدہ میراث ہے، جس پر آج مغرب نے قبضہ کر رکھا ہے۔

پروفیسر حافظ خالد

رہنمای تبلیغیں الاخوان پاکستان

حقیقی جمہوریت کا آغاز حضور نبی کریمؐ کے دور اطہر کے بعد شروع ہوا۔ چاروں خلفاء کا انتخاب دیکھ لیں اس کا تجربہ کریں حضرت عمرؓ نے جن چھ افراد کی کمیٹی بنائی اس تصور کو دیکھ لیں تو آپ کو یہ بات نظرے گی کہ ہم ہی جمہوریت دینے والے ہیں۔ لیکن میں مغربی جمہوریت کی بات نہیں کر رہا ہمارے اپنے تصورات ہیں لیکن ہم یہ تصورات دے کر کہیں کھو گئے۔ یہاں حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کا تذکرہ ہوا لیکن بحثیتِ مجموعی ہم ایک موڑ مرنگے یہ موڑ کی سوال کا ہے۔ آج سے تین سو سال پہلے مغرب میں ارتقاء شروع ہوا کہ بادشاہ کون ہوتا ہے۔ سکالرز نے لوگوں کو شعور دیا اس کے نتیجے میں سب سے پہلے فرانس میں پھر یورپ میں جمہوریت نظر آئی۔

ہماری جمہوریت پر بھی یہاں سیر حاصل بحث ہوئی کہ اس میں نمائندوں کی سو فیصد اکثریت بھی ان احکامات کو جھیٹ نہیں سکتی جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمیں حقیقی طور پر دیئے ہیں۔ اس لئے عدیہ کو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کو روپیو کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ قرآن نمائندوں کے لئے چالیس سال کی عمر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ مجلس شوریٰ میں نمائندے خالی الہیں ہو کر آتے تھے آج جمہوریت جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی باندی ہے۔ حضرت عمرؓ کا قول مشہور ہے کہ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو روزِ حشر کو عمر سے پوچھا جائے گا۔ حضرت عمرؓ انتقال کے بارہ سال بعد اپنے بیٹے عبد اللہ بن عمر کے خواب میں آئے۔ بیٹے نے شکایت کی کہ اتنے عرصے بعد خواب میں ملے تو آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں حساب کتاب دینے میں مصروف تھا۔ میرے دور میں لکڑی کا ایک پل ٹوٹا ہوا تھا اور وہاں سے ایک بکری یعنی گرگئی اور اس کی ناگ ٹوٹ گئی اللہ نے مجھ سے سوال کیا کہ عمر یہ کیوں ہوا۔ آج ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے، ہماری سڑکوں پر جو حداثات ہو رہے ہیں ان کے ذمہ دار حکمران ہیں۔ ہماری فلاح ممکن نہیں جب تک اللہ اور اس کے رسول کے قوانین، اپنی روح کے ساتھ لا گو نہیں ہو جاتے۔

مفتی منصور احمد

کالم نگار نہیں سکا لے

جب ہم بات کرتے ہیں کہ اسلام طرز حیات ہے دستور زندگی ہے۔ یہ درست بات ہے تو کیا اسلام کے پاس اپنا کوئی سیاسی نظریہ یا نظام حکومت نہیں۔ ٹھیک ہے کہ 1924 سے لے کر آج تک اسلامی نظام کہیں نہیں ہے۔ لیکن کیا خلافت کا لفظ اتنا معیوب ہو گیا ہے کہ ہم اسلام کے نظریہ سیاست پر گفتگو کرتے وقت خلافت کا لفظ بولنے پر بھی تیا نہیں ہوتے۔ بعض حضرات نے پوری گفتگو خلافت پر کی اس کے اصول بھی بیان کئے لیکن اس کو نام جمہوریت کا دیا ہے۔ ہر کوئی جمہوریت کے اپنے معنی لیتا ہے کوئی اسے سیکولر کہتا ہے، اس کا مفہوم واضح ہے نہ مقاصد، مشرق کی جمہوریت الگ ہے مغرب کی الگ۔ مجددی صاحب نے کہا کہ ہم اضطراری حالت میں ہیں۔ جمہوریت پر بات کرتے ہوئے عالمی تناظر میں بات کرنی چاہئے کیونکہ مسلمان پوری دنیا میں ہیں جبکہ پاکستان کے آئین کو ہمیں اپنے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ میری نسبت علمائے دیوبند سے ہے میرے ہاتھ میں ایک فتویٰ ہے جو ہمارے پورے مکتب فکر کی نمائندگی کرتا ہے حضرت اقدس شہید اسلام مولانا لدھیانوی صاحب کی کتاب ”آپ کے مسائل اور ان کا حل“، جلد نمبر آٹھ، صفحہ نمبر 176 پر یہ موجود ہے۔

”جمہوریت دور جدید کا وہ صنم اکبر ہے جس کی پرستش اول اول دنایاں مغرب نے کی چونکہ وہ آسمانی ہدایت سے محروم تھے اس لئے ان کی عقلی نار سانے دیگر نظام ہائے حکومت کے معاملے میں جمہوریت کا بہتر ارش لیا اور پھر جب اس کا غلغله بلند ہوا تو مسلمانوں نے بھی تقلید مغرب میں اس کی مالا چھپنی شروع کر دی۔ کبھی یہ نہ رہ بلند کیا گیا کہ اسلام جمہوریت کا علمبردار ہے اور کبھی اسلامی جمہوریت جیسی خبیث اصطلاح وضع کی گئی۔ حالانکہ مغرب، جمہوریت کے جس بت کا پچاری ہے اس کا نہ صرف اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اسلام کے سیاسی نظریے کی ضد ہے اس لئے اسلام کے ساتھ جمہوریت یا اس کی اصلاحات کا پیوند لگانا اور جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنا صریحًا غلط ہے۔“

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہاں پر جو باتیں کی گئیں وہ جمہوریت کو مشرف بے اسلام کرنے کے لئے ہیں۔ جمہوریت کو ہم نے اضطرار کی حالت میں قبول کیا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ پاکستان کو ہم نے جہاد کے ذریعے فتح نہیں کیا اور سری جنگ عظیم کے بعد جب انگریز کا قبضہ اپنی کالونیوں پر منتظر نہیں رہا تو اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ حکومتیں ان کے حوالے کرو نظم ہمارا رہے تاکہ ہماری گرفت مضبوط رہے۔ اس وقت کے معروضی حالات میں اس وقت کے جیدا کا برین دین نے قرارداد مقاصد کا جو راستہ آئین کو دیا وہ ان کی عظیم کامیابی ہے۔ 1973 کے آئین میں جو اسلامی دفاعات ہیں وہ اس کامیابی کی اگلی منزل ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں پچاس ساٹھ سال کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ اسلامی دفاعات کے باوجود یہاں اسلام نہیں ہے۔ اللہ کے احکامات کے نفاذ کیلئے عوامی تائید کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے مکملہ میں اپنے استاد کے درجے کے ایک بزرگ سے گفتگو کی۔ تب سوات کا آپریشن ہور ہاتھ میں نے عرض کی کہ آپ یہ نہ کہیں کہ سوات والے ہماری بات نہیں مانتے آپ یہ نہ کہیں کہ انھوں نے کفر کیا ہے ان کے لوگ علمی بات کر رہے ہیں وہ دلائل کی بات کر رہے ہیں میڈیا پر آکر بات کر رہے ہیں کتابیں لکھ رہے ہیں۔ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم نے ان کے مؤقف کو سنانہیں اور ان کو جواب دینے کی کوشش بھی نہیں کی، ہم نے صرف میڈیا پر بیانات داغے اور ان کو فتوے سنائے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں، میری علمی رائے بھی ان سے مختلف ہے میری ان لوگوں کے ساتھ پوری پوری رات کی مجلسیں میں۔ یہاں جو عملاً بیٹھے ہیں انھوں نے بھی ان کا مؤقف نہیں سنا۔ اب بھی اگر نہیں سنا گیا تو پھر وہی ہو گا جو ہور رہا ہے۔ میں ایک سوال آپ کی خدمت میں رکھنا چاہتا ہوں کہ قرآن میں غلبہ دین کا جو مقصد ہے اور بعثتِ نبویؐ کی جو عملت بتائی ہے وہ کدھر گئی۔ کیا اقامتِ دین صرف یہی ہے کہ ہمارا مرسرہ چلے ہمارا منبر قائم رہے یہاں سے جج کا وزیر لگے اگر یہی کچھ اسلام ہے تو پھر امریکہ و یورپ سے بڑا اسلامی ملک کوئی نہیں کیونکہ وہاں سے جج و عمرے پر جانا آسان ہے یہاں سے جانا مشکل ہے۔ وہاں پر بھی نماز کی ایسی ہی سہولت ہے جیسی یہاں پر ہے۔ امام ابو بکر جصاص نے ”احکام القرآن“ میں جو اجماع نقل کیا ہے کہ اسلام میں ایمان کے بعد اہم ترین چیز غلبہ دین ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے اللہ کے دین کی سر بلندی کیا

چیز ہے اور اگر یہی کچھ درست ہے تو پھر ہمیں اپنے بہت بڑے ماضی اور مصادرِ اسلام سے صرف نظر کرنا پڑے گا۔

علامہ محمد صادق قریشی

نائب امیر تحریک منہاج القرآن

ہمیں بحثیتِ مسلمان یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ نبی کریمؐ کے وارث ہوتے ہمارے کندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داری ماند ہوتی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ فتح کی آیت نمبر 28 اور سورۃ صف میں کیا ہے کہ وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول گودین ہدایت اور دین حق کے لئے سمجھتا کہ اس دین کو عالم ادیان پر غالب کر دے۔ دین صرف روایات کا نام نہیں۔ دین ایک مکمل طرز حیات ہے جس میں ہر چیز شامل ہے جس کا اشارہ سورۃ مائدہ میں بھی فرمادیا گیا کہ جو بھی اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام اختیار کرے گا اللہ کی نگاہ میں وہ نظام قابل قبول نہیں ہوگا۔

دین کے دو ونگ ہیں مذہبی اور سیاسی، سیاسی اسلام میں سیاسی، معاشی استحکام اور سوشل سیکورٹی کا نظام ہے۔ رسول کریمؐ نے جو ریاست مدینہ میں قائم کی وہ ہمارے لئے رول ماؤل ہے اس میں تمام سیاسی جماعتیں تھیں، یہود بھی اس کا حصہ تھے، مشرکین بھی مسلمان بھی اور عیسائی بھی۔ رسول پاکؐ کو سربراہ ریاست تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر خلافت راشدہ ہے جب بھی دین اسلام آئے گا اس کے لئے رول ماؤل خلافت راشدہ ہوگی۔ خلافت کے بغیر اسلام میں کوئی نظام قابل قبول نہیں۔ سیاسی استحکام میں سیاسی جماعتوں کا وجود ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے انتخاب کے وقت انصار یوں کی جانب سے بھی نمائندہ موجود تھا۔ ادھر سے حضرت عمرؓ نمائندہ چنا گیا۔ حضرت ابو بکرؓ پر 33 ہزار افراد نے بیعت کی اور ان کو خلیفہ چن لیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے انتخاب کے وقت حضرت ابو بکرؓ نے ان کو نا مزد کیا تھا۔ پھر شوریٰ عام میں ان کو منتخب کر لیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کی بارچھر کنی پار لیمنٹ تجویز کی گئی جس کے تین تین ووٹ ٹائی پڑ گئے۔ پھر انصار اور مہاجرین مدینہ کی 50 اراکین پر مشتمل کمیٹی کے سامنے کیس گیا اس پر عبد الرحمن بن عوفؓ کو چیف ایکشن کمشن بنایا گیا جنھوں نے گھر گھر جا کر لوگوں کی رائے معلوم کی۔ چند ووٹ حضرت عثمانؓ کے زیادہ ہونے پر

انھیں خلیفہ چن لیا گیا۔ اس دوران ایک اور پارٹی نے راتوں رات سیدنا حضرت علیؑ کے پاس آ کر کہا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں یہی ایشی حضرت ابوکمرؓ کی خلافت کے وقت بھی اٹھایا گیا تھا لہذا یہ بات ثابت ہے کہ سیاسی جماعتوں کا نظام موجود تھا لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ جتنی سیاسی جماعتوں ہوں گی ان کا منشور اسلام کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جو اسلام کے خلاف منشور لائے گا اس کی اسلامی ریاست کے آئین کے اندر کسی قسم کی گنجائش نہیں ہوگی ۔

علامہ عمار خان ناصر و اُس پر پسل الشریعہ کیڈی گوجرانوالہ

موجودہ تناظر میں جب ہم بات کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ووٹ کون دے سکتا ہے خواتین ووٹ دینے کی اہل ہیں یا نہیں، انتخاب کیسے کیا جائے بل واسطے یا بلا واسطے، اس نئتوں میں جو مکاتب فکر شریک ہیں اگر وہ دو تین بنیادی تصورات مان کر آگے بڑھیں تو بات آسان ہو جائے گی۔ ایک نقطہ تو یہ کہ اسلام جس طریقے سے ریاست اور معاشرت کو تشكیل دینا چاہتا ہے اس میں سیاسی طاقت کی اہمیت بنیادی اور مسلم ہے۔ اسلام محض پوچاپ اور اخلاقیات کا مذہب نہیں وہ معاشرے اور ریاست کو خاص شکل اصولوں اور نجح پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسلام کا کوئی ایسا جامع تصور جو ریاست کے کردار سے صرف نظر کرتا ہو وہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا نقطہ یہ ہے کہ اس وقت ہم جس صورتحال میں کھڑے ہیں جس فکر اور تہذیب کی دنیا میں سیادت ہے، جسے سیاسی غالبہ حاصل ہے اس کے زیر اثر مسلمان معاشروں میں تہذیبی، فکری، اخلاقی اور ثقافتی طور پر جو صورتحال ہے وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ وہ تغیر، تبدیلی اور جدوجہد کی تقاضا کرتی ہے۔ اسلامی نمونے میں ہم ریاست اور سیاست سے جس کردار کی توقع کرتے ہیں ہمارا نظام وہ کردار ادا نہیں کر رہا۔ اس کے ساتھ ایک تیسرا نقطہ جس پر بحث ہو سکتی ہے وہ یہ کہ جمہوریت کا ماذل اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ان میں انیں بیس کافر ہے اور ہم اس فرق کو قانون سازی کے ذریعے ہم آہنگ کر بھی لیں تب بھی ہمیں اس وقت مغرب کے فکری اور تہذیبی غلبے کا سامنا ہے۔ مغرب نے جتنے نظام متعارف کروائے ہیں اس میں سرمایہ دارانہ نظام کا جو جبر ہے وہ

اس طرح غالب ہے کہ ہم جمہوریت میں اپنی تبدیلیاں کر کے بھی مطلوب نتائج نہیں لے سکتے۔ اور اگر ہم یہ موقع کریں کہ ہم سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے وہ مطلوب معاشرہ پیدا کر سکیں گے تو یہ خام خیالی ہوگی۔ ہمیں حقیقت کا دراک کرنا ہو گا کہ جب تک یہ سرمایہ دارانہ نظام اور عالمی صورتحال قائم ہے، ہم ایک حد تک ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ جتنی آزادی اس نظام کے اندر ہے اس سے ہم فائدہ اٹھاسکتے ہیں معاشرے اور ریاست کی سطح پر ایک حد تک ہی تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں لیکن جرایسا ہے اور اس کی لگائی ہوئی قدیمیں ایسی ہیں کہ ہم جس مثالی معاشرے اور ریاست کا نقشہ رکھتے ہیں اسے ہم حاصل نہیں کر سکتے۔ سرمایہ دارانہ نظام، ریاست اور معاشرے کو ایک بالکل مختلف سطح پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ اسلام ان ساری چیزوں کو جس سطح پر اس استوار کرنا چاہتا ہے وہ اس سے متصادم ہیں۔ چونکہ قوت میں یہ نظام ہے اس لئے ہم اس کی فراہم کی ہوئی آزادیوں اور موقع کے اندر رہتے ہوئے ہی فائدہ اٹھاسکتے ہیں لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ اس کو چیخ کر کے اور اس کے بندیادی مقدمات کو توڑ کر ایسی مثالی ریاست قائم کر سکیں گے جو ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں تو یہ کم از کم اس وقت کے حالات میں ممکن نہیں۔ ہم اس نظام میں آخری حد کر اس نہیں کر سکتے۔ مجموعی طور پر مسلمان معاشروں کے اہل علم اور مبلغ یہ موقف اختیار کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کی تاریخ، تہذیب اور سیاست میں جو تغیرات آئے ہیں ان کے جرکو ایک امرِ واقعہ مان لیا جائے۔

تصادم جس سے ہم اپنا نقصان مزید کر لیں اور دستیاب موقع سے محروم ہو جائیں اس سے ہم گریز کریں۔ نظام کے اندر جتنی گنجائش ہے اس سے فائدہ اٹھائیں اور پر امن راستے سے شرکو جتنی حد تک روکا جاسکتا ہے روکیں اور کوئی جذباتی راستہ اختیار نہ کریں۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں بعض تبدیلیاں اتنی بڑی سطح پر آتی ہیں کہ جن میں تہذیبیں، تہذیبوں کو فتح کر لیتی ہیں اس کے نتیجے میں سیاسی نظام اور طاقت کا تناسب بالکل بدلتا ہے۔ میرے علم کے مطابق جب کوئی تہذیب دوسری تہذیب پر غالب آتی ہے تو اپنے ساتھ متداول سیاسی اور معاشری طاقت بھی لے کر آتی ہے اس لئے اس تہذیب کو اس کے دور عروج میں چیخ کر کے شکست دینا شاید ممکن نہ ہو۔ اگر ہم ایسا کریں تو اپنی مشکلات ہی بڑھائیں گے اس حقیقت کا دراک کر کے ہم بات آگے بڑھائیں تو بات ہو سکتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ بندیادی نکات پر ہمارے ہاں اتفاق ہے اگر ہم

منصوصات کو الگ رکھتے ہوئے اجتہادی امور میں شریعت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دنیا کی مختلف تہذیبوں نے جو تجربات کئے ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کے دریافت کردہ طریقوں کو ترمیم و اضافے اور اسلامی اصولوں کے مطابق بنالیں تو شاید موجودہ حالات میں بہتری کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ شریعت بہت واضح اور قطعی ہے اس کے تحت وجود میں آنے والے فقہی اور اجتہادی امور میں بڑا واضح فرق ہے۔ شریعت ابدی اور غیر متبدل ہے ہمیشہ کے لئے ہے۔ اجتہادی امور میں حالات اور تہذیب کا بڑا دخل ہوتا ہے ہمیں اس میں فرق کرنا چاہئے۔ اسلام مسلمانوں کی ایک پوری روایت رہی ہے بارہ سو سال ہم نے دنیا پر حکومت کی ہے ہماری اپنا نظام معاشرت اور سیاست رہا لیکن اگر واقعی جر کے تحت کچھ چیزیں ہم پر غالب آگئی ہیں تو ہم ان کے ساتھ ایک طرح کا چلک دار رویہ اختیار کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ شریعت کے منافی نہ ہوں۔ دوسری چیز یہ کہ انسانی تجربات سے فائدہ اٹھانا بذات خود اسلام اور شریعت کا مستقل اصول ہے۔ میں صرف ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یقیناً مسلمانوں کا اپنا علم سیاست رہا حکام سلطنت ایک پوری بحث ہے لیکن بہت سی چیزیں ہم دنیا کی دوسری اقوام سے سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً جمہوریت کا بنیادی تصور ہے کہ اس میں اختیارات تقسیم ہوں گے اختیارات کا ایک جگہ ارٹکا زندہ ہو گا تاکہ استھصال نہ ہو۔ یہ تصور ایک تجربے کے نتیج میں سامنے آیا اس کی افادیت بھی سامنے ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم اپنی تاریخ کے ساتھ تقابل کر کے دیکھ لیں۔ اسلامی تاریخ میں شاید یہ تقسیم اختیارات والا مسئلہ اتنی وضاحت کے ساتھ نہیں آیا جس کی وجہ سے ہمیں بہت سارے مفاسد بھی بچکتے پڑے۔ مثلاً ہم سنتے آئے ہیں کہ جاج بن یوسف نے اتنے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو قتل کروا دیا، عدالتیں موجود تھیں، مسلمان معاشرہ اور علماء بھی موجود تھے مگر جاج کو روکنے کے لئے کوئی میکنزم موجود نہیں تھا کیونکہ اس وقت کے سیاسی نظام یا تصور کے تحت سیاسی مقدمات میں خلیفہ کا فیصلہ ہی حرف آخر ہوتا تھا۔ جاج بن یوسف نے اگر کسی کو سیاسی مقدمے میں پکڑ لیا تو وہ پابند نہیں تھا کہ اس کو کسی عدالت میں پیش کرے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے اگر جرم غداری کا بھی ہو تو سزا صدر یا ذریعہ عظم کی صوابید نہیں ہے۔ اس لئے کیا یہ بات ان کے دائرہ اختیار سے باہر نکال دی گئی ہے میرا خیال ہے کہ ہماری روایات میں یہ بات رہی ہے کہ اگر تمدن اور تہذیب کے

ارقاء نے ایک ایسی شکل سامنے رکھی ہے جو اسلام کے اصول کے خلاف نہیں ہے تو اسے قبول کرنے میں کسی بچکچا ہٹ یا حجاب کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ منطقی طور پر ایک دوسرا موقف بھی اختیار کیا گیا کہ اگر یہ نظام رکاوٹ ہے اور اس کے اندر رہتے ہوئے ہم مطلوب تبدیلی نہیں لاسکتے تو ہم اس نظام کو کیوں قبول کریں اور اس کو چینچ کر کے اس کے غلبے ختم کرنے کی کوشش کیوں نہ کریں۔ جنگ کے ذریعے وہ حالات پیدا کرنے کی کوشش کریں جس کے نتیجے میں وہ رکاوٹ میں ختم ہو جائیں۔ میرا خیال ہے اس وقت جمہوریت کے ناظر میں جو بحث ہو رہی ہے اس میں بنیادی نقطہ ہی ہے کہ اس نظام میں آپ جتنی کوشش کر لیں جتنے پوندگالیں اگر یہ ہمارا مقصود نہیں تو پھر ہم کیوں اس کی پابندی کریں وہ راستے کیوں نہ اختیار کریں جس میں ہم اس نظام کو چینچ کریں اور اس کو ختم کر کے اسلامی ریاست اور معاشرے کے قیام کی راہ ہموار کی جائے۔ میرا خیال ہے ان حضرات کے ساتھ دونکات پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ میں مفتی صاحب سے اتفاق کرتا ہوں کہ جزوی طور پر کچھ بتیں ضرور ہوئی ہوں گی مگر بھیت طبق کے اس نقطہ نظر کے حاملین کے ساتھ مکالمہ نہیں ہوا اور اگر کوئی بات ہوئی بھی تو اس لمحے میں کہ پاکستان کے بڑے بزرگ علماء نے ایک راستہ اختیار کیا ہوا ہے تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ اس سے مختلف راستہ اختیار کریں۔ یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہو سکتی ہے مگر مکالمے کی روح نہیں ہے آپ مکالمہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی روح لب ولجہ مختلف ہوتا ہے۔ ایک فریق اگر استدلال رکھتا ہے تو آپ اس سے اختلاف رکھ سکتے ہیں مگر مکالمے میں آپ کو اس کی بنیاد کو موضوع بنانا پڑتا ہے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا اور اگر آپ یہ راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے نزدیک اس کے مفاسد کیا ہیں۔ مکالمے کے لئے ایک دونکات کو بنیاد بنا کر بات آگے بڑھائی جاسکتی ہے مگر پہلی بات یہ کہ وہی نقطہ نظر کہ یہ حضرات آپ سے کہیں گے کہ آپ نظام کے دائرے میں جو جدوجہد کرنا چاہتے ہیں اس کے نتیجے میں وہ تبدیلی نہیں آسکتی اس لئے اس سے مختلف راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ ان حضرات سے یہ سوال پڑت کر کرنا چاہئے کہ جو راستہ آپ تجویز کر رہے ہیں کیا حالات و واقعات میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے کہ وہ راستہ اختیار کرنے سے اس کے مقابلے میں زیادہ بہتر تبدیلی پیدا کی جاسکے جو کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے کی جا رہی ہے۔ خواہشات الگ چیز ہے یا کچھ ایسی مذہبی پیشگوئیاں جن کے

انطباق کا مسئلہ ہمیشہ ہمیں پیش ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر آپ کچھ امیدیں یا تصورات قائم کر کے ایک راستہ اختیار کریں گے کہ اگر ہم یہ کریں تو انشا اللہ، اللہ کی نصرت آجائے گی۔ اس سے ہٹ کر واقعات اور حالات کے دائے میں حالات کو سامنے رکھ کر اس سوال کا جواب ان حضرات سے پوچھنا چاہئے کہ آپ بتائیں آپ جو راستہ تجویز کر رہے ہیں وہ راستہ عملاء ہمیں کہاں پر پہنچائے گایا پہنچا سکتا ہے۔ اس کے حوالے سے ہمیں ماضی سے بھی سبق سیکھنا چاہئے۔ جب انگریز بر صغیر میں آئے تو ان کے خلاف ایک وقت تک یہی راستہ اختیار کیا گیا اس میں علمائے دیوبند سب سے پیش ہیجھ گراس کے بعد انہوں نے اس راستے کی خطرناکیوں کا احساس بھی کیا اور اس راستے سے صفحہ نمبر 21 پر درج چند مختصر اقتباسات بھی پیش کروں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا بلکہ انگریز کے جانے کے بعد وہ جو نقشہ اس خطے کا دیکھ رہے تھے اس میں اسلامی ریاست نام کی کوئی چیز نہ تھی اس میں ایک سیکولر ریاست تھی جس میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو۔ اس نیاد پر انھیں تب سے مذہبی نوعیت کے اعتراضات کا بھی سامنا کرنا پڑا کہ آپ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کر رہے ہیں اور ان کی بالادستی قبول کر رہے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے لیکن میں مثال کے طور پر پیش کروں گا۔ مولا نا لکھتے ہیں۔

”علماء نے بار بار از مینہ سابقہ میں کامیابی کی انہائی کوشش کی مگر سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا، حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نے کیا کچھ نہیں کیا مگر کیا ہوا؟ 1857ء میں حاجی مداد اللہ صاحب اور مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی نے کیا کیا نہیں کیا مگر کیا ہاتھ آیا؟ 1914ء میں حضرت مولانا شیخ البند نے کیا کیا نہیں کیا مگر کیا پیش آیا؟“

ہمیں تاریخ کو بطور ایک سبق دیکھنا چاہئے اس کے بعد علماء سے ایک بہت ہی اہم سوال کہ جب آپ حکمتِ عملی بناتے ہیں تو خالی تصورات، خیلات یا مذہبی آئینہ ملزم پر نہیں بناتے بلکہ معروضی حالات بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

علامہ خلیل الرحمن

مذہبی سکالر، مدیر ماہنامہ سوئے جاز

یہ بحث جس رخ پر چلی گئی ہے یہ ادھوری رہے گی اگر ہم اس میں کچھ اضافہ نہ کریں، تبدیلی احوال کی کوششیں جس کو تمکنت دین کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق، احیائے اسلام سے بھی موسوم ہے ہمارا دینی طبقہ اس حوالے سے منقسم ہے یہ تین طرح سے جدوجہد کرنا چاہتا ہے پہلی جدوجہد تو جمہوری محاذوں کے اوپر ہے۔ اس نظام کے تحت وہ قوت نافذہ حاصل کر کے شریعت کا نظام اس کی روح کے مطابق لانا چاہتا ہے۔ ”اعصانہ ہو تو کلیمی ہے کاریبے بنیاد، قوت نافذہ کے بغیر تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کوشش میں مذہبی پس منظر رکھنے والی سیاسی جماعتیں سمجھی شامل ہیں جو اس تگ دو میں شریک ہیں۔ آئین پاکستان کو بھی انہی جماعتوں کی تائید حاصل ہے دوسرا طبقہ جس کی طرف مفتی منصور اور علامہ عمار خان ناصر نے بھی نشاندہی کی وہ تبدیلی کے لئے مسلح جدوجہد پر لعین رکھتا ہے۔ ایک اور طبقہ بھی ہے جو جمہوریت کو کسی درجے پر مانتا تو ہے لیکن ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ نظام بوسیدہ ہو چکا ہے اور اس کی تنظیم نو کی ضرورت ہے اور اس کے لئے وہ عوامی انقلاب کی بات کرتا ہے لیکن طریقہ کاری بھی ہے کہ بہت سارے لوگ سڑکوں پر آ جائیں اور نظام کو اکھاڑ پھینکیں۔ ایک چوتھی تقسیم بھی ہے ایک طبقہ انقلاب کی بات بھی کرتا ہے اور جمہوریت کے مزے بھی لوٹ رہا ہے۔ المیہ بھی ہے کہ یہ سارے مکاتب فکر ایک صفحہ پر اکٹے نہیں ہیں اگر ہو جائیں تو ہمیں اس نظام کے اندر رہتے ہوئے بھی قوت نافذہ مل سکتی ہے۔ جمہوریت ایک نظام حکومت بھی ہے اور ایک فلسفہ بھی، اس کے کچھ اصول اور قدریں ہیں اگر آپ ان کا جائزہ لیں تو آپ کا لگے کا یہ اسلام سے کافی مشاہدہ رکھتی ہیں مثلاً قانون کی حکمرانی، عدل و انصاف، انسانی حقوق، حریت فکر اور مساوات یہ سارے تصورات جمہوریت کے فلاں سے ماخوذ ہیں۔ طریقہ کاری میں بھی کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہم انتخابات کی بات کرتے ہیں تو اس کے جمہوریت کے تحت کیا اصول ہیں اور خلافت کے تحت کیا ہیں۔ ایک اصول تو سلسہ ہے کہ کوئی بھی اپنی مرضی اور منشاء کے تحت مسلط نہیں ہو سکتا اسے عوامی تائید کی ضرورت ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کس جمہوریت کی بات کرتے ہیں یہ پاکستان میں کیوں نہیں ہے جہاں سے ہم جمہوریت

مستعار لیتے ہیں وہاں یہ مستحکم بھی ہے اور ڈیلیور بھی کر رہی ہے وہاں قانون کی حکمرانی ہے۔ کڑا احتساب ہے کسی وزیر مشیر سے کوئی لغزش ہو جائے تو فوراً مستحقی ہو جاتا ہے یہاں لکڑا ہضم پھر ہضم والی بات ہے کوئی پوچھنے والا نہیں اس بات پر تحقیق کی ضرورت ہے کہ اصل جمہوریت یہاں پر کیوں نہیں پروان چڑھ کی۔ آپ 1973 کے آئین کی بات کر لیں جس پر تمام جمہوری قوتوں متفق ہیں مگر اس قانون کو بنے ہوئے بھی 41 سال ہو گئے اس دوران 18 سال تو آرمی قابض رہی دو دو بار منتخب وزراء عظم کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ماورائے آئین یا آئین کے اندر رہتے ہوئے اپنے مقاصد حاصل کر لئے گئے۔ حالیہ ایکشن کے نتائج دیکھ لیں عوام نے انھیں مسترد کر دیا جو ڈیلیور نہیں کر سکے جمہوری قوتوں کو کام تو کرنے دیا جائے۔ ایک اور بات جو میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارا آئین مکالمے کے لئے صحیک نہیں ہے مکالمے کے لئے آپ کو آئین میں موجود غلطیوں کا جائزہ لینا ہوگا اور دوسرے طبقے کے اعتراضات کا جواب دینا ہوگا۔ ایک الطو اہری کی کتاب آپ نے پڑھی ہو گی۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ اس میں آئین پاکستان پر صرف آٹھ اعتراضات ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک آٹھ اعتراض پر ہو سکتا ہے کہ علامہ عمار صاحب بھی متفق نہ ہوں ایک دوپر میں بھی متفق نہیں ہوں اس طرح ہو سکتا ہے کہ پانچ چھوٹے اعتراضات یہیں اڑ جائیں اور باقی ایک دو ہی رہ جائیں۔ لیکن میری رائے ہے کہ ان اختلافات کو دیکھنا چاہئے۔ اسلام احتساب کا بڑا داعی ہے جمہوری روایات بھی یہی ہیں ہمارے خلاف بھی خود کو احتساب کے لئے پیش کرتے تھے لیکن آپ مجھے بتا یہیں کہ اس آئین کے تحت ایک وزیر کا انتخاب کتنا سہل ہے اور کتنا مشکل۔ پہلے آپ سوال لکھ کر سپیکر کو دیں گے اس پر ایک ایک ماگز رجاتا ہے بحث کی اجازت نہیں ملتی اس کے بعد ایک نیا ایشور آچکا ہوتا ہے۔ یہ کس طرح کی جمہوریت ہے جمہوریت تو یہ ہے کہ آپ خلیفہ وقت کو پکڑ کر پوچھتے ہیں کہ آپ کا کرتا اتنے کم کپڑے میں کیسے سل گیا۔ اس کو جواب کے لئے اپنے بیٹے کو سامنے لانا پڑتا ہے کہ تم جواب دو۔ احتساب کا طریقہ کارتنا پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کیا یہ تقاضا نہیں کرتا کہ ہم اس کو بدلتے ڈالیں۔ پہلے آپ نے آئین میں دو ٹرم سے زیادہ پر پابندی لگادی پھر اٹھا دی اب آپ نفرے لگا رہے ہیں کہ موروثی سیاست آگئی ہے میں یہاں سیدنا عمر فاروقؓ کا حوالہ دوں گا، آپ سے کسی نے کہا کہ آپ خلافت اپنے بیٹے کو کیوں نہیں دے دیتے جس پر آپ نے

جواب دیا کہ اگر خلافت اچھی چیز ہے تو خاندان خطا ب کا ایک آدمی اس سے بہرہ ور ہو چکا اور اگر بری چیز ہے تو ایک بندہ بھگت چکا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب تک میری آنکھوں میں دم ہے اس وقت تک میں خود انجوائے کروں گا اور اس کے بعد میرا بیٹا تو ہے ہی۔ پھر سیاسی جماعتوں کے اندر کہاں جمہوریت ہے بلکہ سے لے کر عہدے با منٹ تک آپ کوہیں جمہوریت نظر آتی ہے۔ آئین کی حد تک انصاف کا تذکرہ کر دیا مگر وہ کسی کوں نہیں رہا سادہ سی بات ہے کہ Justice delayed is justice denied۔ ہم لوگ خود کوئی ذمہ داری نہیں اٹھاتے اور اسلامی نظریاتی کوں سل پر ذمہ داری ڈال رہے ہیں جس کی عملی طور پر کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اگرچہ اس میں تمام مکاتب فکر کی نمائندگی ہے مگر حکومت کے نزدیک اس کی اہمیت ایک ردنی کی ٹوکری سے زیادہ نہیں ہے اس کا کام صرف مشورہ دینا ہے اور وہ بھی اس وقت جب حکومت مانگے۔ آئین کے لئے نہیں صرف قانون کے لئے آپ کے پاس دوسرا فرم و فاقی شرعی عدالت کا ہے جس میں آپ جا کر فیصلوں کو چیخ کر سکتے ہیں لیکن اس کے بھروسے کیا صورتحال ہے ہم کتنے عرصے سے شور مچا رہے ہیں کہ اس کے بھروسے کی تقریبی کا طریقہ کارہائیکورٹ کے بھروسے سے مساوی ہونا چاہئے۔ نہ کہ ان کو کٹر کٹ یا سیاسی رشوت کے طور پر کھا جائے تاکہ یہ لوگ جرأت کے ساتھ شرعی موقف آپ کے سامنے رکھ سکیں۔ اس کی تازہ مثال سودا فیصلہ ہے 1991 میں جب یہ فیصلہ آیا تو ہم لوگ بڑے خوش ہوئے مگر اس کے بعد یہ ایک بیٹھ میں چلا گیا پھر فیصلہ آیا پھر نظر ثانی کی درخواست آگئی۔ 2014 آگیا مگر یہ کھلوڑ ابھی تک جاری ہے۔ یہ جدوجہد 1981 سے شروع ہوئی اب پھر اسی مقام پر کھڑی ہے ان ساری چیزوں کے لئے کیا ہمیں امریکہ یا استعماری قوتوں کا ڈر ہے۔ ان سارے مسائل کا حل ہم جمہوری دائرے کے اندر رہتے ہوئے حل کر سکتے ہیں۔

مفتي منصور

کالم نگار، مذہبی سکالر

علامہ عمار ناصر نے بات بڑی بھرپور کردی ہے میں اس بارے میں ایک دو باتیں ضرور کروں گا مولانا نے جو موقف رکھا وہ عالمی حالات میں بہت عمده ہے مگر امر واقعہ یہ ہے کہ ہم اس

نظام پر مجبور کر دیئے گئے ہیں یہ میں یا اعتراف ضرور کرنا چاہئے کہ ہم نے اس نظام کو بے امر مجبوری قبول کیا ہوا ہے یہ بہتر نہیں ہے۔ تصادم سے نچھے کی ترغیب تو سمجھ میں آتی ہے مگر اس نظام کی ترغیب سمجھ میں نہیں آتی۔ جب علمی حلقوے اس نظام کی ترغیب دیں گے تو بات بڑی غلط ہو جائے گی۔ جن حضرات کی مثالیں ہم اس طرح کے معروضی حالات میں دیتے ہیں اگر وقت ہوتا تو میں تفصیل میں جاتا کہ جب انہوں نے ترکِ تصادم یا ترکِ تشدد کا فیصلہ کیا تو انہوں نے مخصوص حالات سے نکلنے کا راستہ دیا۔ بھی وجہ ہے کہ شیخ الہند کا استغفاری سب کے سامنے ہے۔ مولانا ابوالحسن ندوی نے ”تاریخ دعوت“ میں بڑی جامع بات کی کہ دیوبندیین چیزوں کا نام ہے علم، تقویٰ اور جہاد۔ اس چیز کو بھی سامنے رکھا جائے ایک بات یہ بھی ملحوظ رہے کہ کیا حضرت مدینی، حضرت تھانوی یا شیخ الہند جن حالات میں فیصلہ فرماتے تھے آج جن حالات میں ہم کھڑے ہیں کیا یہ وہی حالت ہے یا اس سے دگرگوں ہے یا اس سے بہتر ہے۔ یہ فیصلہ بھی ضرور کرنا چاہئے پھر آپ ترکِ تصادم کی بات پاکستان کی سرحدوں کے اندر لے آئے ہیں میں یہ سوال ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں پر تصادم ہم نے شروع ہی نہیں کیا، ہم تصادم پر مجبور کر دیئے گئے۔ افغانستان، فلسطین، کشمیر اور برما کا مسئلہ، کیا وہاں کے مسلمانوں کو بھی یہی ترغیب دینی چاہئے کہ دشمن آپ کو تباہ کر دے آپ کی تہذیب و تمدن کا خاتمہ کر دے مگر آپ پھر بھی ترکِ تصادم کریں اور اس کا فیصلہ اپنی اگلی تہذیب پر چھوڑ دیں۔ میں نے پہلے بھی اس فورم پر کہا تھا کہ تکمیر و خروج سے زیادہ ہم مسئلہ جہاد ہے اس پر بات کرنے کی ضرورت ہے۔

سوالات و جوابات

محمد سعادت علی، متعلم جامعہ نیعیہ

میرا سوال علامہ صادق قریشی صاحب سے ہے کہ کیا ملوکیت کے اندر نظام شریعت اور حدود اللہ کا نفاذ کیا جائے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے جیسا کہ برونائی نے کیا ہے، کیا نفاذ اسلام سے ان کی ملوکیت بھی جائز ہو گئی ہے یا نہیں؟

جواب:-

علامہ صادق قریشی، نائب امیر تحریک منہاج القرآن

بہت اچھا سوال ہے میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اسلام کے عطا کردہ نظام کی آئندیل صورت خلافت راشدہ ہی ہے اس کے بعد ملوکیت بھی شروع ہوئی اگر ملوکیت کے اندر جمہوریت کی روح موجود ہے تو اسلام اس کو بھی قبول کرتا ہے، اس کا انکار نہیں کرتا۔ لیکن آئندیل صورت خلافت راشدہ کی ہی ہو گی اسی کی طرف بالآخر لوٹ کر جانا ہو گا ملوکیت میں کسی صورت وہ اقدار نافذ نہیں ہو سکتیں۔

سوال

خالد محمود، متعلم جامعہ نعییہ

میر اسوال مفتی منصور صاحب سے ہے آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ بالکوہہ اسلام کا نفاذ کیا جاسکتا ہے، جب ہم حالاتِ حاضرہ کو لیکھتے ہیں تو کیا ہماری حکومتیں اس نجح پر پہنچ چکی ہیں کہ ان کے خلاف بالکوہہ جہاد کیا جائے اور اسلام کو نافذ کیا جائے یا پھر اس کی کوئی دوسری صورت بھی نکل سکتی ہے؟

جواب:-

مفتی منصور، کالم نگار، مذہبی سکالر

یہاں پر بالکوہہ سے مراد طاقت نہیں ہے یہاں پر اسلامی نظریاتی کو نسل کی سفارشات ہیں اس لئے یہاں پر امکانی سطح پر تو اسلام نافذ ہے یہ بحث یہاں کے علماء میں کسی سطح پر بھی موجود نہیں کہ یہ دارالسلام ہے یا نہیں۔ وہاں بالکوہہ ہونا ضروری ہے بالکوہہ کے بعد دوسرا درجہ بالغیل ہوتا ہے۔

سوال:-

نواز کھرل، صحافی

ہم علماء سے سنتے آئے ہیں کہ اگر کوئی شخص عہدے کے لئے خود کو پیش کرے تو ایسا آدمی اچھا نہیں ہوتا اور اس شخص کو وہ عہدہ نہیں دیا جانا چاہئے لیکن ہمارا جو نظام انتخاب ہے اس میں تو

امیدوار خود کو پیش بھی کرتا ہے اور ووٹ بھی مانگتا ہے اس لحاظ سے ہم اس نظام کو کیسے اسلامی کہہ سکتے ہیں ؟

جواب:-

مفتي محمد زاہد، وائس پرنسپل جامعہ امدادیہ فیصل آباد
اگر ہمارے درمیان کوئی آئینی ماہر ہوتے تو امر واقعہ کی وضاحت بہتر طریقے سے کرتے۔

مثال کے طور پر آئین کے اندر لکھا ہوا ہے کہ صدر کو سزا معافی کا اختیار ہے علماء کے نزدیک یہ اسلامی طریقہ نہیں اگر کوئی آئینی ماہر ہوتا تو ہمیں بتاتا کہ وہ کون سے حالات ہوتے ہیں جب صدر یہ اختیار استعمال کرتا ہے وہ کن امور اور جرم کی نوعیت کو مد نظر رکھتا ہے یا نہیں۔ جہاں تک طلب منصب کا معاملہ ہے یہ بحث نہیں۔ علماء اور محدثین اس پر آراء دیتے رہے ہیں تاہم مثالی صورت تو یہی ہے کہ کچھ لوگ امیدوار تجویز کریں۔ جیسا کہ ہمارے آئین میں بھی ہے کہ دو لوگ تجویز کرندا ہوتے ہیں لیکن بعض حالات میں استثنی کی اجازت حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کا واقعہ بھی ہے بعض علماء اس بات پر متفق ہیں کہ کچھ حالات میں خود کو منصب کے لئے پیش کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

صدر ارتی خطبه
ڈاکٹر راغب نعیمی
پرنسپل جامعہ نعیمیہ لاہور

آج کی گفتگو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں مکالمے کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہو گا، مکالمے کی اہمیت مجادلے اور مناظرے سے بڑھ کر ہے۔ مکالمے کے ذریعے ہم جان سکتے ہیں کہ دوسرے آدمی کا موقف کیا ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے وہ کون سے دلائل دیتا ہے۔ ان دلائل کو دیکھتے ہوئے ہم یہ فیصلہ کریں گے کہ کیا ان دلائل کو قبول کر لیا جائے یا پھر ان کو رد کرنے کی کوئی معقول دلیل موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مکالمے کی حقیقی روح کے ساتھ آج کی یہ نشست اپنے اختتام کو پہنچی ہے۔ جہاں تک جمہوریت کی بات ہے ہم ذرا تصور کریں جب مسلمان پوری دنیا پر

حکومت کر رہے تھے یہ وہی دور ہے جب یورپ انڈھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یورپ نے اس تعلیم کی بنیاد پر جو مسلمانوں سے مستعار لی تھی، ترقی پر گامزن ہوا۔ لیکن آج کے حالات دیکھیں 1857ء یا 1924ء کے بعد کیا یہ مسلمانوں کے لئے سیاہ دو نہیں ہے۔ جمہوریت کا موجودہ تصور ہمارے فتحیں کا دیا ہوا ہے جب یہ تصور آیا تو ہماری ایک کنسسل نے اس کے آگے مزاحمت کی دوسری نے کچھ چیزیں اپنالیں اور تیسری نے اسے من عن قبول کر لیا۔ جمہوریت کے بارے میں ماضی میں ہمارا رویہ کیا تھا اور آج کیا ہے۔ جو علماء معاملات کو گہرائی کے ساتھ نہیں دیکھتے ان کے نزدیک ہمارا آئین غیر اسلامی ہے۔ جو فکری مباحث آج یہاں ہوئی ہے یہ صرف اسی صورت سودمند ہو سکتی ہے جب اس کا ماحصل ایک عام امام مسجد کو بھی ملے۔ دوسری یہ کہ جب ہم نے یہاں پر آئین، پارلیمنٹ اور اجماع کی بات کی ہے۔ علامہ اقبال کا تصور اقتداء جو پارلیمنٹ سے متعلق ہے اس پر بات کی جاسکتی ہے اسی طرح علامہ اقبال² نے Reconstruction of Islamic Thoughts میں جو نظریہ پیش کیا ہے جس میں تین ایوانی سسٹم کی بات کی گئی ہے۔ ان کے اوپر علماء کی ایک جماعت کا تصور دیا گیا ہے جو تمام قوانین کے اوپر چیک رکھیں۔ جب علامہ نے یہ تصور دیا اس وقت ایران میں علماء کی کونسل موجود تھی انہوں نے اس کونسل کے فوائد و فوائد بھی بیان کر دیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کا تصور بھی شاید علامہ کے اسی تصور سے لیا گیا ہے۔ لیکن یہ اس طریقے سے تشكیل نہیں ہو پائی جس طرح علامہ کا تصور تھا۔ یہاں پر سیاسی جماعتوں کی بات کی گئی میں سمجھتا ہوں کہ ایک اسلامی ملک میں کیا کسی غیر اسلامی ایجنسٹ کی سیاسی جماعت کی گنجائش ہو سکتی ہے اگر نہیں تو پھر نہ ہی اور غیر نہ ہی سیاسی جماعتوں کی تقسیم کی بات کیوں ہے۔ یہاں پر پارلیمانی یا صدارتی نظام کی بات کی گئی کیا صدارتی نظام ملوکیت کے قریب نہیں ہے جہاں پر صدر کے نیچے چار چھ بندے ہی مقابرک ہوتے ہیں۔ آج کل اس میں ترمیم کر کے صدر کے نیچے کا انگریز کو رکھ دیا گیا ہے۔ جہاں تک پاکستان کی بات ہے کیا پاکستان کی تشكیل ایک جمہوری روئیے کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ گوکہ انگریز یہاں سے جانا چاہ رہا تھا مگر اس نے یہاں کے لوگوں کی رائے لے کر پاکستان بنایا۔ پاکستان جبرا طاقت کے بل بوتے پر نہیں لیا گیا۔ یہاں پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ آج کل جو لوگ کہتے ہیں کہ قائد اعظم سیکولر تھے کیا ایک سیکولر

بندے نے اسلامی ریاست بنانی تھی۔ دوسرے مکتب فکر کا کہنا ہے کہ قائدِ اعظم کے خیالات بدل چکے تھے اور ان کے اندر اسلام کا نقطہ نظر بہت واضح ہو گیا تھا۔ ایسے سوالات بھی بحث طلب ہیں۔ ایک بات بالکل واضح ہے کہ آئینہِ قانون ہوتا ہے تو بندہ مطلوب تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آئینہِ قانون کے حصول کے لئے قوت نافذہ بھی ہونی چاہئے۔ فکری مباحثت کو قوت نافذہ کے بغیر نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن دوسرا سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے عامتہ الناس ان فکری مباحثت کو قبول کرنے کو تیار ہیں بھی یا نہیں۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس کی بنیاد تھانے پکھری کلچر کے اوپر ہے۔ یہ ایسے لوگوں کو ہی اسمبلیوں میں بھیجتا ہے جو ان کے اس طرح کے مسائل حل کر سکتیں اگر یہ میرے اور آپ جیسے بندے کو جن کی سرشنست میں ہی صدقی پیمانی ہے کو اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں تو وہ تو ان کے ایسے کام نہیں کرے گا پھر کیا یہ ایسے بندے کو دوبارہ منتخب کریں گے۔ یہاں صدر کی جانب سے سزاوں کو معاف کرنے پر بات ہوئی ہے اس وقت آٹھ ہزار سے زائد مجرموں کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی ہے مگر حکومت ان پر عمل درآمد نہیں کر رہی۔ صرف آڑیکل 45 پر بحث کیوں، ہمیں اس پر بھی بحث کرنی چاہئے کہ جن کو سزا ہو چکی ہے اس پر عمل درآمد کیوں نہیں ہو رہا۔ اگر سزاوں پر عمل ہو گا تو معاشرے میں تطہیر ہو گی۔ کھل صاحب نے نمائندوں کی جانب سے طلب منصب کی بات کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے آئین میں اس مسئلے کا حل پیش کر دیا گیا ہے ایک یہ کہ پہلے پارٹی تک دیتے وقت اور اس کے بعد جب یا لیکن کمیشن میں کامنزات جمع کرانے جاتے ہیں تو ایک تجویز کنندہ اور ایک تائید کنندہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں آئین کے باغیوں کا سوال اٹھایا گیا میرا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ عدالتوں کو کرنا چاہئے کہ جو آئین کو نہیں مانتے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہئے۔ اسلام میں اس وقت تک حزب اختلاف کا تصور ہے جب تک دو فریقوں میں سے کسی ایک کا چنانچہ نہیں ہو جاتا جیسے کے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا انتخاب جب ہو گیا تو مہاجرین نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور انصار نے بھی۔ جو تصور آج حزب اختلاف کا یہاں پاکستان میں ہے کہ جو ہار جاتا ہے وہ چار چھ ماہ بعد حکومت کی ٹانگیں کھینچنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اسلام کا تصور نہیں ہے۔

مکالمہ سوم

تاریخ: 11 اگست 2014

بمقام: اسلام آباد

میزبان: محمد عامر رانا، ڈاکٹر یکٹھ پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز اسلام آباد

صدرات: ڈاکٹر قبلہ ایاز، وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

محرك بحث: ڈاکٹر خالد مسعود، سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل حکومت پاکستان

شرکاء گفتگو:

مفتی محمد خطیب مصطفوی، مہتمم مدرسہ فاطمہ الزہرا اسلام آباد

ڈاکٹر شیداحمد، اسٹنٹ پروفیسر شیخ زید اسلام سینٹر پشاور یونیورسٹی

علامہ ممتاز نظامی، پرنسپل جامعہ محمدیہ غوثیہ چک شہزاد اسلام آباد

پروفیسر راجح محمد اسلم خان، تنظیم الحق راولپنڈی

خورشید ندیم، کالم زکار واپسی پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد

پروفیسر مشتاق احمد، ڈیپارٹمنٹ آف لاءِ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

صاحبزادہ حسن فاروق، پی ایچ ڈی سکالر شیخ زید اسلام سینٹر پشاور یونیورسٹی

ڈاکٹر منیر احمد، خطیب کی مسجد آغا خان روڈ 6/F اسلام آباد

علامہ عبدالقدوس محمدی، ترجمان وفاق المدارس العربیہ اسلام آباد

اسلام آپاد میں منعقدہ مباحثے کے شرکاء



ڈاکٹر قبلہ ایاز

وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

حالیہ عالمی تناظر میں یہ موضوع بہت اہم ہو گیا ہے۔ عراق، صومالیہ، افغانستان اور یمن بلکہ مغربی دینا میں بھی مسلمان اپنے معاشروں سے اور آبائی ممالک کے حالات سے متاثر ہو کر اسی فقہ کے سوالات اٹھا رہے ہیں۔ اس لئے یکسوئی کے ساتھ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا دینی طبقہ بہتر طریقے سے دوسرے لوگوں کی رہنمائی کر سکے۔ اپنے ملک اور ملت اسلامیہ کے لئے ہتر لائک ایڈیشن کا منتخب ہو۔

ڈاکٹر خالد مسعود

سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل

پاکستان اور عالم اسلام میں اسلام کے سیاسی نظام پر بہت بات ہوتی ہے۔ یہ دور جدید کی اصطلاح ہے اور اس پر بات ہوتی ہے اگر ہم اپنی فقہ کی تاریخ کو دیکھیں تو دو چیزیں میں عرض کروں گا ایک تو یہ کہ یہ فقہ کی عام کتابوں کا موضوع ہی نہیں ہے اور اس پر بحث نہیں ہوتی۔ جب فقہاء سے درخواست کی گئی کہ اس موضوع پر رہنمائی کریں تو اس پر الگ سے کتابیں لکھی گئیں۔ ما وردی سے لے کر اب تک حتیٰ کتابیں لکھی گئیں ان میں خلیفہ کو منتخب کرنے کے جو طریقے بیان کئے گئے ان سب کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا گیا کہ اسلام میں ایسے ہوتا ہے۔ ہمارے استاد کہتے تھے کہ احکام کی تین قسمیں ہیں ایک تکلفی ایک وضعی اور ایک ا مضامی، ا مضامی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تجربے سے حاصل ہوا۔ اس پر علماء نے کہا کہ یہ بھی ایک طریقہ ہے خلیفہ کا انتخاب یا حکومت کی شکل کیا ہوگی۔ جو تجربات تاریخی طور پر ہوئے امت مسلمہ نے اس کو جو کیا اور وہ ہمارے اصول میں شامل ہو گئی۔ اب ان سب کیلئے ایک اجتماعی اجتناد کی ضرورت ہے انفرادی آراء، تجربہ اور نظر یات اب ہمارے پاس کافی ہیں۔ اتفاق رائے قائم کرتے ہوئے کچھ اصول طے ہیں۔ ان پر انسیوں اور بیسیوں صدی میں بحث ہوتی ہے لیکن ابھی تک یہ انفرادی یا کچھ جماعتوں کی رائے ہے۔ دوسری چیز جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری سوچ اور فقہ میں حتیٰ بحث ہے وہ ادارتی کم

اور شخصی زیادہ ہے۔ یعنی خلیفہ کی شکل میں یہ چیزیں ہونی چاہئیں، خلیفہ کی یہ شرائط ہیں اس کو ہم نے ادارتی انداز میں پیش نہیں کیا جیسے کہ ماوردی کی کتاب میں بحث ہے کہ اگر خلیفہ کی ذات، اقتدار یا خلافت کے اصول کا مرکز ہے تو پھر جو آگے عہدے ہیں ان کی حیثیت کیا ہے؟ انہوں نے پہلی مرتبہ کہا کہ ان کے نائبین کی حیثیت اپنی نہیں بلکہ خلیفہ کی دی ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس کو شخصی سے بدل کر ادارتی میں لے آئیں۔ اگرچہ یہ چیز دنیا کی سیاست میں اٹھارویں صدی سے ہی آچکی ہے۔ ہماری جو فکرانیسوں میں صدی سے آئی ہے اس میں بھی ادارتی شکل ہے لیکن ابھی تک روایتی فقہ اس طرح بات کرتی ہے کہ خلیفہ کی شرائط کیا ہیں؟ تمیرانقط جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری فکر میں دو ابہام ہیں جو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک تو اللہ کی حاکیت سے مراد اللہ کی حکومت یا تھیو کریں نہیں اور نہ ہی خلیفہ اللہ کا نمائندہ ہے لیکن اس کی وضاحت ہونی چاہئے۔ کیونکہ خلیفہ کا انتخاب اللہ نے نہیں کیا ہوتا بلکہ یہ عوام کا انتخاب ہے۔ چاہے اس کا طریقہ جو بھی ہو۔ ہمارے آئین میں یہ مسئلہ حل کر لیا گیا ہے مگر ہماری فکر میں ابھی تک ہے کہ خلیفہ اللہ کا نمائندہ ہے یا عوام کا نمائندہ۔ عوام کے نمائندے کے بارے میں خاص طور پر جمہوریت کی بحث میں ہم عام طور پر اس کو رد کرتے ہیں کہ حاکیت صرف اللہ کی ہے۔ یہ ایک ابہام ہے میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا مگر ان بحثوں کو صحیح کرنے کی ضرورت ہے۔ اصل میں اللہ کی نمائندگی کا مطلب یہ ہے کہ شریعت ہمارا نقطہ ہو گا جس پر سب کا اجماع ہو گا اور شریعت کی برتری یا آج کے مطابق قانون کی حکمرانی۔ اللہ کی حکمرانی شریعت کے ذریعے ہوتی ہے جو قانون کی حکمرانی کا اصول ہے۔ قانون کی حکمرانی کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ وہ شخصیت کا اتباع نہیں ہے بلکہ وہ قانون کا اتباع ہے اور اس کے لئے صرف انفرادی رائے یا فنونی نہیں بلکہ اس کے لئے اجماع کی ضرورت ہے۔ وہ اجماع صرف علماء کا یا فقہاء کا اجماع نہیں بلکہ اب جو صورت حال ہے اس میں بہت سے دوسرے لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے شعبے کے ماہر ہیں وہ بھی اس میں شامل ہوں گے اور لازمی طور پر اس میں عوام کی نمائندگی بھی ہوگی۔ آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ابھی ہم ان بحثوں میں ہیں اور دنیا کی تھیوڑی بہت خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس میں پہلے قومی ریاستوں کا نظر یہ تھا ہم ابھی اس بحث میں تھے، پھر دنیا میں دو بڑی طاقتیں نہیں۔ انہوں نے دنیا میں جتنی

بھی قومی ریاستیں تھیں ان کو ختم کیا اب دنیا میں ایک پاور ہے۔ اس وقت امریکہ اور مغرب میں بحث چل رہی کہ ریاست کو کسی قانون کا پابند نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کی اپنی ایک طاقت ہوئی چاہئے۔ یہ تھیوری State of Exception کے نام سے چل رہی ہے۔ ہمیں یہ بحثیں بھی دیکھنا ہوں گی کہ جو ریاستیں ہم سے آگے چل رہی ہیں وہ کیا کر رہی ہیں۔ بجائے اس کے کل ہم یہ سوچیں آج ہی توجہ کر لیں۔ بحث اصل میں یہ ہے کہ پہلے مغرب نے قانون کو اخلاق سے عیحدہ کیا اور اب ریاست کو بھی قانون سے عیحدہ کیا جا رہا ہے اس کے خلاف مذہب کے نمائندگان اور سوچ رکھنے والے ساری دنیا میں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ Global Ethics کے نام سے یا وہ اخلاقی اقدار جن کو دنیا مانتی ہے ان کی طرف آیا جائے۔ قانون کو اخلاق سے عیحدہ کر کے رکھنے سے ایک طرف تو اس کی بنیاد دیں کمزور ہوتی ہیں اور دوسرا قانون کا غلط استعمال بہت ہوتا ہے یہ چار نکات آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

پروفیسر راجہ اسلم خان تحریک حق پاکستان

پاکستان کا موجودہ آئین سیکولر لوگوں نے بنا یاد دینی لوگوں نے نہیں۔ ہندوستان کا آئینی ارتقاء اس بات کے گرد گھومتا ہے کہ اصل حکمران انگریزوں ہوں گے اور ان کے کاسہ لیس برائے نام نمائندے ہوں گے۔ اس دو عملی کا مظاہرہ 1935 کے آل انڈیا کیٹ میں بھی ہے یہی 1956 کے آئین اور 1973 کے آئین میں نظر آتا ہے کہ اصل حکمران کوئی اور باقی اس کے چچے 1973 کے آئین میں علماء کی کوئی نسل بنائی گئی جسے بعد میں اسلامی نظریاتی نسل کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی اسلام کو مشاورت کی حیثیت دی گئی اس پر بھی کبھی عمل نہیں ہوا۔ کیونکہ قانون 1861ء کا چل رہا ہے 1861 کا پیش کوڈ جسے تعزیرات پاکستان کہا جاتا ہے وہ آج بھی رائج ہے۔ سیاسی نظام لارڈ کلائیکوکاری ہوا ہے جو خود ایک مجرم تھا۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ قانون، امراء کے لئے اور ہے اور غریب کے لئے اور۔ میری اپنی سوچ ہے کہ جس معاشرے میں قانون کی حکمرانی نہ ہو اس کے بڑے مجرم جیلوں میں جانے کی بجائے اقتدار کے ایوانوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلام کہتا ہے

کہ جب تک پاکستان میں رول آف لائیٹنیس ہوگا جمہوریت کچھ دے نہیں پائے گی۔ دنیا میں جتنے بھی نظام میں انہوں نے ساری اچھی چیزیں اسلام سے لی ہوئی ہیں مگر مغرب ہمیں کہتا ہے کہ اسلام کا نام نہ لو۔ پاکستان دنیا کا واحد و فاق ہے جسے وحدانی طرز پر چلایا جا رہا ہے۔ اکائیوں کی حیثیت نظر انداز کر دی گئی ہے ہمیں احتساب کا نظام قائم کرنا پڑے گا۔ سود غیر شرعی ہے مگر آج تک لیا جا رہا ہے۔

علامہ ممتاز نظامی

پرنسپل جامعہ محمدی غوثیہ چک شہزادہ اسلام آباد

انسان اپنے لیے روزاول سے لے کر اب تک تمام نظام ہائے حیات کا تجربہ کرتا چلا آ رہا ہے۔ مابعد دور کے مفارکرین تجربہ شدہ نظاموں کے خصوصات اور تقاضی جائزوں سے ہمارے ذوق کی تسلیکیں کے لوازمات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ روز قیامت تک جاری رہے گا۔ انسانی فطرت کے عین مطابق اللہ کریم نے اپنے دین کو افرادی اور اجتماعی دونوں جہتوں سے مزین فرمایا ہے۔ افرادی سطح پر فراہم چیز ایمان ہے اور اجتماعی سطح پر اہل ایمان کے مجموعے کو وحدت کہا جاتا ہے۔ چونکہ اسلام اجتماعیت کا علم بردار ہے۔ اس لیے اس نے انسانی زندگی کو آسانیاں فراہم کرنے والے تمام نظام ہائے حیات مثلاً خاندان، ریاست معاشرہ سب کی بنیاد اجتماعیت پر رکھی۔ اور ان ساری چیزوں کا جو ہر فلاح انسانی میں رکھ دیا ہے۔ اس قاعدے اور کلیے کے مطابق ہر وہ نظام جس سے انسانیت کی فلاح کا پہلو ابھرتا ہو اور وہ اسلام اور شریعت کے دائرے کے اندر ہو وہ مقصود اصلی ہے۔ اس کو جمہوریت، خلافت یا شوریٰ کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ علمی، معاشی، طبی اور قانونی میدانوں کے ساتھ ساتھ ہمیں سب سے بڑا چیخ سیاسی میدان میں بھی درپیش ہے۔ موجودہ سیاسی نظام جو جمہوریت یا کسی اور نام سے چل رہے ہیں ان میں کون سا نظام اسلام کے قریب تر ہے۔ اس کا آسان اور سادہ جواب یہ ہے وہ نظام جو انسانی فلاح کا ضامن ہو۔ میں اس ضمن میں حضرت مولانا مفتی مذیب الرحمن کی رائے سے اتفاق رکھتا ہوں کہ ”فی زمانہ جمہوریت، ہی وہ نظام ہے، سارا معاملہ عملی نفاذ کا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنا نظام عمل کھو چکے ہیں۔

چاہے وہ انفرادی ہو یا خاندانی، ریاستی ہو یا دستوری، سیاسی ہو یا معاشی کسی بھی سمت یکسوئی نہیں رہی۔ آئین اور جمہوریت سمیت تمام دستاویزات زندگی ”کتابی“ شکل میں محفوظ اور داعی حیثیت حاصل کرچکی ہیں۔ ہر شق اپنی ضمی شقوں سمیت واضح اور روشن ہے۔ فقط کمی عمل کی ہے۔ کسی بھی نظام اور عمل کا رشتہ روح کی مانند ہوتا ہے۔ اگر جسم میں روح ہی نہ ہو تو چاہے ظاہر جسم کتنا ہی تو انا ہو پر کشش اور حسین کیوں نہ ہو ایک خاص مدت کے بعد اسے فن کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس کی بدبو سے معاشرے میں تغفیل پھیل جائے گا۔ اسلام کے ابتدائی دور، خاص کر خلافتِ راشدہ میں عمل کی قوت بہت زیادہ تھی بھی وجہ ہے کہ اس نظام کو عرب و عجم میں فلاحتی نظام کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ نظام عمل میں کچی آتی گئی اور اس نظام کے تبادل نظاموں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ حالانکہ بادشاہت اور شہنشاہیت کے باوجود حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے دور میں سیاسی نظام کے ایک ستون ”عدل“ کا عملی نفاذ ہوا۔ اور ان کا دور ایک درخشش ستارے کی مانند چمک پڑا۔ ہمارا یہ بھی المید رہا ہے کہ ہم اصل بیماری کے علاج کی بجائے معاشرے پر دیسی، یونانی، ہومیو پیٹھک اور انگریزی نئے آزمانے میں مصروف ہیں۔ جب کہ اسلام نے اس کا آسان حل ”عمل“ اور ”فلاح“ میں رکھ دیا ہے۔ احباب ذی وقار! سوال فقط یہ ہے ان ساری چیزیں کے نفاذ کا طریقہ کارکیا ہے۔ انہیں عملی شکل کیسے دی جائے۔ حالانکہ قرآن کریم، سیرت طیبۃ النبی ﷺ، خلافتِ راشدہ، اور 1400 سالوں کی حسین روایات، ہمارے دامن میں کیا کچھ نہیں ہے۔ اور اتنی گم شدہ کھولنے کی ضرورت ہے۔ انہیں کمی شکست سے پہلے بصیرتوں کے سارے سوتے ہمارے ہاں سے پھوٹتے تھے۔

ڈاکٹر رشید احمد

اسٹنٹ پروفیسر شیخ زید اسلام سٹریٹ اسٹریٹ یونیورسٹی

اسلام کا سیاسی نظام اگرچہ ایک نئی اصطلاح ضرور ہے مگر ہمارے قدیم ادب اور قرآن کریم میں اشاروں اور عبارتِ الناس کے ذریعے یہ مضمون خلافت کے نام سے موجود ہے۔ اصول تو یہاں موجود ہیں مگر شاید سیاسی فریم ورک

اس طرح نہ ہو جس طرح کے نماز روزہ کی عبادات کے حوالے سے ہے۔ ایک بحث کو
 ہمارے قدیم علماء نے آگے بڑھایا ہے مثلاً امام ابو یوسف، امام ابو عبدیہ القاسم یا پھر ماضی قریب
 میں شاہ ولی اللہ سب نے اس تصور پر بات کی ہے۔ اسلامی
 ریاست کے تصور پر تو شاید اختلاف موجود نہ ہو کہ اس کے لوازمات کیا ہوں گے۔ البتہ
 اس کے قیام پر اختلاف ضرور موجود ہے یہ اختلاف شاید خلافت کے ادارے کے قیام سے پہلے
 نہیں تھا جب یہ ادارہ ختم ہوا تو یہ رونما ہوا، اب ہمارے سامنے دو تین نقطے نظر ہیں۔ اگر وہ ہمارے
 سامنے موجود ہوں گے تو شاید ہم اس بحث کو اچھی طرح سمجھیں گے مثلاً ہندوستان میں مولانا و
 حید الدین خان سرے سے اسلامی ریاست کو مانتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی کوئی
 ضرورت ہی نہیں ہے۔ دوسری طرف مولانا مودودی ہیں جنہوں نے اسلامی ریاست کے قیام
 کے لئے زور لگایا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حزب التحریر اور القاعدہ جیسی تنظیمیں موجود ہیں جو
 خلافت کے قیام کے لئے باقاعدہ کوشش کر رہی ہیں اور خاص کر حزب التحریر ہے۔ ابھی چند ماہ قبل
 میں قازقستان گیا تھا وہاں ہمیں بتایا گیا کہ سُنْنَةِ ایشیاء اور خاص کر ترکمانستان میں حزب التحریر کے
 ممبران بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تصور موجود ہے لیکن اسلامی
 ریاست کے قیام کے حوالے سے مختلف نقطے ہائے نظر ہیں جن کی طرف ہمیں توجہ دینی ہو گی کہ
 قرآن اور حدیث کی نصوص اس حوالے سے کیا ہیں۔ دوسری بات یہ کہ نسب امامت پر بھی
 مسلمانوں کا اختلاف کہیں پر نہیں البتہ سنیوں اور شیعوں میں یہ اختلاف موجود ہے۔ اہل تشیع اس
 امامت کو منصوص مانتے ہیں اور آج بھی ایران کے روحانی رہنمای خامنائی امام غائب کی نیابت
 کرتے ہیں۔ وہاں امام ولایت فقیہ کے حوالے سے جو تصور ہے، وہ خلافت کا ہی تبدل ہے۔ اس
 پر بھی بحث کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد اگر ہم عصر حاضر میں آجائیں تو کیا
 جمہوریت، خلافت کی تبدل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ کیا جمہوریت اور خلافت کے لوازمات ایک ہیں یا
 پھر مختلف ہیں اس کے لئے ہمیں جمہوریت کی ابتداء کی طرف جانا ہو گا عام طور پر کہا جاتا ہے کہ
 جمہوریت یونان سے یا فرانچ انقلاب سے شروع ہوئی لیکن اگر ہم خود اسلامی تاریخ کو دیکھیں اور
 چاروں خلفائے راشدین کے طریقہ انتخاب پر غور کریں وہاں جمہوریت کی روح کا فرم انظر آتی

ہے۔ آئین پاکستان کے حوالے سے میں یہ کہوں گا کہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل نمبر ایک میں لفظ جمہوریہ استعمال ہوا ہے کہ مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہو گا اس طرح آرٹیکل نمبر دو میں کہ اسلام، ریاست کا نام ہب ہو گا۔ اب ڈاکٹر منیر صاحب نے بڑی اچھی بات کی ہے کہ کیا ہم ریاست کو انسان مان سکتے ہیں یا نہیں کہ ریاست مسلمان کس طرح ہو گی۔ اس طرح آرٹیکل ٹو میں کہا گیا کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لئے مختص کی گئی ہے۔ اس طرح آرٹیکل ٹو ایف میں اسلام کے جمہوریت، حریت اور عدل و مساوات کے اصولوں کا اتباع کیا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ آئین پاکستان جمہوریت کا دعوے دار ہے اس کے خلاف نہیں ہے۔ آج کی جمہوریت کے لوازمات میں ریاست ہے، حکومت ہے پارلیمنٹ ہے ووٹر کی شرعی حیثیت ہے۔ ہمارے آئین میں 62 اور 63 کی شقیں ہیں ان کی حیثیت پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

مفہی محمد خطیب مصطفوی

مہتمم مدرسہ فاطمہ الزہرا اسلام آباد

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اسلام محض رسم و رواج، روایت اور روحانی تصورات کا مجموع نہیں ہے۔ بلکہ اسلام انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ جس کے مطابق وہ اپنی روزمرہ زندگی اپنے افعال، اعمال حتیٰ کہ سیاست، معاشریات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اسلام سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام سب کے لیے انصاف، شرافت، دیانت اور عزت کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہے۔ تو حیدر بانی اور مساوات انسانی اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اسلام میں سب انسان برابر ہیں۔ مساوات، آزادی اور اخوات اسلام کے اساسی اصول ہیں۔

اسلام سے قبل ہر طرف ملوکیت اور شخصی آمریت کا بول بالا تھا۔ بادشاہ اور آمراپنی ساری رعایا اور سارے ملک کے لیے قانون بنانے کے مجاز تھے۔ لیکن جن کے لیے قانون بنایا جا رہا تھا ان کی پسند، فائدے، نقصان اور ضروریات کا قطعاً خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ مطلق العنوان حکمران کی جو مرضی میں آتا وہی ملک کا قانون قرار پاتا تھا خواہ اس کی وجہ سے عوام کا کتنا ہی استھان کرنا پڑے۔ اسلام نے جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں قابل قدر، دور رس اور انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں

کیں وہاں سیاسی زندگی کو بھی نئے اصولوں سے آشنا کر دیا۔ اس نے جو سیاسی نظام دیا وہ شورائی نظام ہے۔ جس کا تعلق عوام سے ہے۔ اس نظام میں لوگوں سے ضرور مشورہ لیا جاتا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ رعایا کہ دل جوئی ہوتی ہے بلکہ انہیں اپنی اہمیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اور استبدادی طریقہ کار سے جو مجبوری اور محرومی کی گھٹشن قلب و روح کو ڈس رہی ہوتی ہے اس سے نجات مل جاتی ہے۔ نیز تو می سطح پر کسی اہم معاملہ کے متعلق فرد واحد کا فیصلہ نافذ کرنا بہت بڑی زیادتی ہے ہو سکتا ہے وہ اپنے محدود علم، ناقص تجربہ یا اپنی ذاتی منفعت کے باعث کوئی غلط فیصلہ کر دے جس کا نقصان ساری قوم کو برداشت کرنا پڑے اور پھر اس کی تلاشی ممکن نہ ہو سکے۔ اس لیے مشورہ کا حکم دیا کہ ہر ایک اپنی اپنی قابلیت، تجربہ اور معاملہ بھنی کی صلاحیتوں کے مطابق مشورہ دے۔ اس کا ہی حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دیا چنانچہ ارشاد فرمایا وامر حرم شوری پیغمبر۔ یعنی ان کے سارے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ دستور تھا کہ جب بھی کوئی مشکل یا پیچیدہ مسئلہ پیش آتا تو سب اکٹھے ہو جاتے اس کے ہر پہلو پر گفتگو کرتے اور آخر کار ایک نتیجے پر پہنچ جاتے۔ خود نبی کریم ﷺ کا بھی یہی معمول تھا کہ جب بھی کوئی اہم معاملہ ہوتا تو صحابہ کرامؐ نے بلا کر مجلس مشاورت منعقد فرماتے اور بحث کے بعد فیصلہ فرماتے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں جلیل القدر صحابہ کرامؐ پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ مقرر کی ہوئی تھی جس میں ہر اہم معاملہ کا فیصلہ فرماتے۔ موجودہ دور میں جمہوری نظام حکومت میں چونکہ مشاورت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور اس میں اکثر فیصلے باہم مشورے سے ہوتے ہیں اور مشورے سے حکومتی نظام کو چلانا جمہوریت کی اصل روح ہے۔ اس لئے جمہوری نظام حکومت اسلام کے شورائی نظام حکومت سے زیادہ قریب ہے۔

جمہوری نظام میں اگر کوئی خامی ہے تو وہ یہ کہ یہاں منتخب نمائندوں کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے قانون سازی کریں اور مطلقاً قانون سازی کا اختیار رعایتی نمائندوں کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن آئین پاکستان میں عوایی نمائندوں کو اس بات کا پابند کر لیا گیا ہے کہ وہ جو بھی قانون سازی کریں گے وہ قرآن و سنت کے مطابق ہوگی اور کوئی قانون بھی قرآن و سنت کے خلاف نہیں بن سکتا۔ اس طرح پاکستان کے آئین میں اس خامی کو بھی دور کر لیا گیا ہے۔ آئین پاکستان میں

حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے لئے مانی گئی ہے۔ قوانین کو قرآن کو سنت کے مطابق بنانے کا کہا گیا ہے۔ اس طرح اس آئین کو اگر من و عن اس کی روح کے مطابق نافذ کیا جائے تو یہ ایک اسلامی آئین ہے۔

علامہ عبدالقدس محمدی

ترجمان وفاق المدارس العربیہ اسلام آباد

آئین کے بارے میں ایک مثال دوں گا کہ آپ حضرات نے سنا ہو گا کہ جب ہاتھی کا پچھہ چھوٹا ہوتا ہے تو اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی جاتی ہے اس وقت اس کے پاؤں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی، وہ ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب وہ ناکام ہو جاتا ہے تو اس کے ذہن اور دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ یہ زنجیر مجھ سے ٹوٹ نہیں سکتی لہذا جب وہ بڑا ہو جاتا ہے اور اس میں طاقت آتی ہے اور وہ زنجیر کو توڑ سکتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مقاعد اس کا دیباچہ ضرور ہتا ہے کہ میں نے اس حالت میں رہنا ہے۔ ہمارے پاکستان کے آئین کا معاملہ بھی یہی ہے۔ البتہ مجموعی طور پر آئین پاکستان علماء کی مگر ان میں تیار ہوا۔ قرارداد مقاصد اس کا دیباچہ ضرور بنی تاہم جیسا ہمارے ہاں عموماً ہوتا ہے کہ قانونی پیچیدگیوں میں بہت سارے ایسے چور دروازے چھوڑ دیے جاتے ہیں کہ جن کی وجہ سے کبھی بھی حالات بہتری کی طرف نہیں جاتے وہی صورتحال ہمارے آئین کے ساتھ بھی ہوئی لیکن اس پر بہت زیادہ بات چیت نہیں ہوئی کیونکہ اکثر حضرات نے حکمت کا تقاضا گردا۔ کیونکہ سیکولر طبقہ پاکستان کا چہرہ مُسخ کرنا چاہتا ہے یا اس کو اپنے مقاصد سے ہٹانا چاہتا ہے۔ علماء کو یہ بات بتانی ہو گی کہ آیادیباچہ متن کی حیثیت رکھتا ہے یا نہیں رکھتا۔ ہمارا تصور واضح ہونا چاہئے۔ بلاشبہ قرارداد مقاصد ہمارے آئین کی بنیاد ہے مگر کیا اس بنیاد کو وہ مقام اور حیثیت حاصل ہے یا نہیں۔ ہمیں بار بار پڑھایا جاتا ہے کہ پاکستان میں اسلام کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی۔ پہلے قرآن و سنت کا لفظ تھا اس میں وضاحت تھی پھر اس کے بعد اس میں اسلام کا لفظ لا یا گیا آپ حضرات جانتے ہیں کہ پرویز مشرف کے دور کا اسلام اور ہوتا ہے اور ضیاء الحق کے دور کا اسلام اور ہوتا ہے۔ ذاتی نقطہ نظر کے حوالے سے اس میں آمیزش بھی ہو

جاتی ہے۔ پھر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کے خلاف کسی قسم کی قانون سازی نہیں ہو گی لیکن سوال یہ ہے کہ پہلے جو خلاف اسلام تو انہیں موجود ہیں ان کی تطہیر یا صفائی کا کیا بندوبست ہے۔ اس حوالے سے نہ بات ہوتی ہے نہ اسے زیر بحث لا یا جاتا ہے جس کی وجہ سے قانون کے اندر جہاں جہاں تطہیر کی ضرورت تھی وہ نہیں ہو سکی اور جو کوششیں ہوئیں وہ بھی سیاست کی نذر ہو گئیں۔ آپ حضرات جانتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی ممبر شپ کے اصول کا طریقہ کار کیا ہے اس کا میuar کیا ہے آپ سب حضرات کو علم ہے کہ اس کی ممبر شپ کو یو یوں کی طرح بانٹا جاتا ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ میں بہت ساری چیزیں ایسی بھی ہوئیں مثلاً ختم نبوت کا معاملہ ہے قادیانیت کے حوالے سے 1974 کا پارلیمنٹ کا فیصلہ ہے جو کہ ہماری تاریخ کا تابناک باب ہے۔ اسی طرح لفظ ناموس رسالت کے حوالے سے 295-C کا معاملہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اس دور کے جید علماء کی جد جہد کا نتیجہ ہے لیکن بعد میں حقوق نسوان بل کے عنوان کے تحت ہمارے ساتھ جو ہوا، وقتاً فوقتاً شوگر کو ڈگ گولیاں ہمارے آئیں کو دی گئیں۔ ہمارا دائرہ مسجد و مدرسہ تک ہی ہے آئینی موشکاں فیوں کے میدان کو جب ہم نے دوسرے کرم پر چھوڑ دیا تو بہت سارے ایسے چور دروازے بنائے گئے جن کے نتیجے میں قیام پاکستان کے مقاصد حاصل نہیں ہو سکے۔ اس ساری صورت حال کا ادراک کرنا ہو گا، ہم نے کہاں کہاں کیا کرنا ہے اس کا تعین کرنا ہو گا تاکہ ہم اس کشتنی کو ساحل پر کنار کر سکیں۔

ڈاکٹر منیر احمد

خطیب کی مسجد آغا خان روڈ، ایف، سکس اسلام آباد۔

جہاں تک جمہوریت اور خلافت کا معاملہ ہے میں ڈاکٹر حمید اللہؒ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں ان سے خطبات بہاؤ پور میں ایک سوال کیا گیا کہ اسلام کا نظام جمہوریت کا ہے یا خلافت کا، اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ اسلام کا نظام جمہوریت کا بھی ہے اور خلافت کا بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ کی بعثت کے زمانے میں بھی ایک طرح کی جمہوریت قائم تھی۔ مثال انہوں نے دی کہ حضرت عمرؓ کے والد گرامی کو خارجی امور دینے گئے تھے اور دوسرے سرداروں کے

اپنے اپنے کام تھے۔ مثلاً کئی علماء نے لکھا کہ اس زمانے میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا فیصلہ بھی جمہوری تھا۔ یعنی جب دوقبیلوں کی لڑائی ہوتی اور ایک سردار کی بیٹی کو جنگی قیدی بنا کر مردوں کے ساتھ لے جایا گیا تو مخالف قبیلے کے سردار کے بیٹے نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا اس کے بعد جب مصالحت ہوئی اور جنگی قیدیوں کو واپس کیا جا رہا تھا تو اس کے شوہرنے اسے اختیار دیا کرتم چاہو تو واپس جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ ہی رہنا پسند کرو۔ سردار کی بیٹی نے پسند کیا کہ میں اپنے والد کے ساتھ ہی رہوں گی۔ اس پر قبیلوں کے سردار نے فیصلہ کیا کہ یہ پیٹیاں ہماری عزت پر داغ بنی ہوئی ہیں تو کیوں نہ یہ روایت ڈال دی جائے کہ انہیں پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جائے تاکہ ہمارے لئے داغ نہ بینیں۔ اسی بنیاد پر ایکیوں کا قتل شروع ہوا جو نبی کریمؐ کی بعثت کے بعد ختم ہوا۔ جب نبی کریمؐ نے خطبہ ججۃ الوداع فرمایا تو آپؐ نے کہا کہ جاہلیت کی تمام کی تمام رسماں میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ اب یہاں پر تمام ان باتوں کو ختم کر دیا گیا جنہیں اس وقت کی جمہوریت نے قبول کیا تھا۔ رسول اکرمؐ نے وہاں کی جمہوریت کو ختم کر کے وحی الہی کو نافذ فرمایا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جو جمہوریت وحی الہی کے تالیع ہو تو ایسی جمہوریت کے اسلام خلاف نہیں ہے۔

جب جمہوریت وحی الہی سے آگے نکل جائے تو پھر اسلام مخالفت کرتا ہے ہمارے ہاں جو آئین میں موجود ہے اگر اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اس میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی چیز نہیں ہوگی۔ مگر اس کے باوجود اس میں کئی چیزیں خلاف اسلام ہیں۔ مثلاً ہمارا معاشی نظام پورے کا پورا قرآن و سنت کے خلاف ہے اور وہ چل رہا ہے۔ یہ معاملہ بارہا دلتون میں گیا مگر عملاً کچھ نہیں ہوا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پورے آئین کی نفی کر دیں۔ پچھلے دور میں جب طالبان سے بات ہو رہی تھی تو ان کی جانب سے کہا گیا کہ قرآن و حدیث کی موجودگی میں آئین کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ اصول تو قرآن و حدیث کے ہوں گے لیکن اس کی تشریحات دور حاضر کے تناظر میں ہوں گی اور آئین اس کی وضاحت کرے گا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے مثال کے طور پر دیکھیں کہ ہمارے ہاں ٹرینک کے قوانین ہیں، خارجہ امور ہیں جنہیں ہر دور میں نئے سرے سے مرتب کیا جاتا ہے۔ اس کے اندر ترجمیں کی گنجائش ہوتی ہے جب کہ قرآن و حدیث میں ترجمیں کا کوئی نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی گنجائش ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث میں اس بات کا

اختیار دیا گیا ہے کہ وہ معاملات جن میں اجماع اور قیاس کا دخل ہے اس کے اندر تبدیلی لائی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ قرآن و حدیث سے متصادم نہ ہوں۔ ہمارے ہاں جو اسمبلی موجود ہے ان کے ممبران کے لئے وہ تمام شرائط ہیں جو کہ ایک عادل حکمران کے لئے ہیں۔ اب اگر عملی طور پر ایسا نہیں ہو رہا تو اس پر بات نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے یہ بات کی جائے کہ ہمارے آئین پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا۔ یورپ میں اگر ہم جنس پرستی کا قانون آتا ہے تو ہمیں اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ وہ قرآن و سنت کے تابع نہیں ہیں۔ انہوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ جو لوگ کثرت رائے سے فیصلہ کریں گے وہ قابل قبول ہو گا۔ مگر ہمارے ہاں یہ ہے کہ کثرت رائے اگر ایک طرف ہو اور قرآن و سنت دوسری طرف تو کثرت رائے کو اہمیت نہیں دی جائے گی۔ جمہوریت خلاف اسلام نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ جب خلیفہ بنے تو وہ خلیفہ بنے سے پہلے لوگوں کے پاس آئے اور آکر انہوں نے اعتماد کا ووٹ حاصل کیا۔ اکثریت رائے نے انہیں خلیفہ بنایا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ خلیفہ نامزد کر دیا گیا تو وہ مسجد میں آئے اور تمام لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ مجھے خلیفہ بنادیا گیا ہے اگر میں غلط کروں تو مجھے روکیں۔ یہیں معاملہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا ہے جب سلیمان بن عبدالمالک کے حوالے سے انہیں خلیفہ بنایا گیا تو وہ سب سے پہلے مسجد میں تشریف لائے اور خطاب فرمایا کہ مجھے خلافت کی ذمہ داری میں بیٹلا کر دیا گیا ہے اور اگر آپ چاہیں تو میرے خلیفہ بننے کی توثیق کریں اور اگر آپ چاہیں تو کسی اور کو خلیفہ بنادیا جائے، یہ سب تاریخ کا حصہ ہے۔

حسن فاروق

پی ایچ ڈی سکالر شیخ زید اسلامک سینٹر پشاور یونیورسٹی

ہم نا زک حالات سے گزر رہے ہیں اس لئے ماضی کو، کو سنا وقت کی ضرورت نہیں ہمیں قابل عمل حل ڈھونڈنا ہو گا۔ مختلف نظام ہائے حکومت دنیا میں آئے، کچھ مشہور ہوئے کچھ ختم ہو گئے۔ اسلام اس دور کی ہر مشکل کو حل کرنے کی استطاعت رکھتا ہے مگر کئی چیزیں اسلام میں بھی حل طلب ہیں اس کے سوالات ہمیں اسلام سے بھی چاہیں جس طرح حکومت کے انتخاب کا معاملہ ہے تاریخ میں ہمیں کوئی مستقل نظام نہیں ملتا۔ ہمارے ہاں خلیفہ اور شوریٰ کے اراکین کی بات تو کی

جاتی ہے۔ لیکن سوال بڑا بھیم رہتا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب کون کرے گا اور شوریٰ کے اراکین کا انتخاب کون کرے گا۔ جمہوریت کی بات محبوب موضوع ہے جب ہم کسی نظام کا دوسرا سے مقابل کرتے ہیں تو ہمیں اس نظام کے بارے میں جانا چاہئے۔ اس کو پڑھنا چاہئے اگر ہم جمہوریت کو مغرب کے ناظر میں دیکھیں تو شاید اسلام میں اس کی گنجائش نہ ملے لیکن اوصاف کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام ہمیں اس سے زیادہ جمہوری لگتا ہے۔ کسی بھی نظام کو چلانے کے لئے دستور کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت جو نظام ہمارے ملک میں ہے اس کو نہ جمہوری کہا جا سکتا ہے نہ ہی اسلامی، کہیں کہیں پر بہت بہم چیزیں ہیں اگر آج ہم ایک قانون پاریمنٹ میں پیش کریں جو کہ شرعی تقاضوں کے عین مطابق ہو مگر اس کے

لئے بھی ہمیں اکثریت کی حمایت درکار ہوگی۔ کیا جو چیزیں پہلے سے اسلامی اور شرعی ہوں ان کے لئے یہ پیمانہ صحیح ہے۔ ہمارے ہاں اقتدار اعلیٰ کا تصور اللہ جلہ شانہ کے پاس ہے۔ مغرب میں یہ عوام کے پاس ہے اسلام میں شخصی آزادی لاحدہ و نہیں جب کہ مغرب میں یہ غیر محدود ہے۔ جمہوریت کا کوئی مستقل مزاج نہیں ہے جب کہ اسلام مستقل مزاجی پر زور دیتا ہے۔ نظام کی بات کریں تو اسلام کا نظام خلافت اور نیابت کا ہے مگر اس کا مزاج جمہوری ہے۔ آئین پاکستان، کیا یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی، بڑی دلچسپ بحث ہے قرار ادا مقاصد ایک طرف آئین کا دیباچہ ہے، اب سپریم کورٹ آف پاکستان کا کوئی نجج اسے آئین کا حصہ مانتا ہے کوئی نہیں مانتا کہیں فیصلے اس کے مطابق آجاتے ہیں کہیں خلاف آجاتے ہیں۔ انتخابات کا جو جمہوری طریقہ ہے اس میں پانچ علاوے دین ایک طرف لیکن دس جاہل اپنے ووٹ کی بناء پر فیصلہ اپنی مرضی کا فیصلہ کروالیں گے۔ اگر جمہوریت کے تحت پورے ہندوستان سے رائے لی جاتی تو شائد پاکستان کبھی نہ بنتا۔ اکثریت ایک الگ مسئلہ ہے، پاکستان کے آئین میں اسلامی اقدار کا تحفظ نہیں کیا گیا بلکہ صرف وعدے کئے گئے ہیں۔ سو دو کو جلد سے جلد ختم کرنے کا وعدہ تھا مگر آج تک نہیں ہوا۔ اسی طرح اسلام میں قاضی کے لئے اس کا عادل ہونا شرط ہے۔ مگر دستور میں اس کے لئے صرف پاکستانی ہونے کی شرط ہے۔ اسی طرح بعض شرعی سزا ایسی ہیں جن کا پاکستان کے قانون میں وجود نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں جمہوریت کو اپنے نظام اور اقدار کے تحت اختیار کرنا چاہئے جیسا کہ سب

ممالک نے کیا، جمہوریت اسلام سے بہت زیادہ مطابقت رکھتی ہے لیکن اس کے اوصاف میں، انتظام میں نہیں۔ پارلیمنٹ میں علماء کی تعداد دس فیصد بھی نہیں جب کہ قانون سازی کے لئے دو تہائی اکثریت درکار ہوتی ہے۔

جمہوریت میں اکثریت کی نہیں بلکہ اقلیت کی حکومت ہوتی ہے ایک حلقة میں پانچ بندے لڑ رہے ہوتے ہیں 12 ہزار والا جیت جاتا ہے۔ 30 ہزار ووٹ لینے والے چار لوگ ہار جاتے ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ جمہوریت کا جائزہ لیں اور تضادات ختم کریں۔ ہمارے دستور میں بنیادی نفاذ ہیں اگر ہمارا دستور ان نفاذ کے ساتھ سوال بھی چلتا رہے تو بھی یہ اسلامی نہیں بن سکے گا۔

پروفیسر مشتاق احمد

شعبہ قانون میں الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ہمارے کے پی کے، کے ضلع بونیر کے لوگ بہت سادہ اور قسم کے مشہور ہیں۔ وہاں ہمارے بڑے روحانی بزرگ سید علی تزمنی بونیر بابا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہیں ایک بڑی پہاڑی چوٹی علم نام کی بھی ہے۔ ایک بونیری سے کسی نے پوچھا کہ پیر بابا بڑا ہے یا علم، تو اس نے کہا کہ آپ نے خدا کو بھی ایسے ہی مختصے ڈال دیا ہے جیسے مجھے ڈال دیا۔ کیم ستمبر 1994 کو میں اسلامی یونیورسٹی میں شریعہ اینڈ لاء کے سٹوڈنٹ کے طور پر آیا، آج کیم ستمبر 2014 ہے۔ 20 سال تک میں جو پڑھتا پڑھاتا رہا آج اس پر اتنے تابڑ توڑ حملے ہوئے ہیں کہ اب میں بھی اُس بونیری کی طرح مختصے میں پڑ گیا ہوں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ آخر میں ہم کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں پیر بابا یا علم؟ میری گزارشات چند نکات پر مشتمل ہیں۔ میرے سامنے بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان کا موجودہ دستور اسلامی ہے یا نہیں ہے۔ یہاں دستور اور قانون کے درمیان بھی الجھاؤ نظر آتا ہے۔ تو یہیں رسالت کے قانون C-295 کو آئین کہا گیا۔ مگر میری توجہ دستوری نکات پر ہو گی۔ پاکستان کا دستوری نظام اسلامی ہے یا نہیں اس کے بارے میں متضاد آراء ہیں کہ یہ اسلامی نہیں ہے۔ کسی حد تک ہے، بہت حد تک ہے۔ ایک اور گروہ جس نے شریعت کی بالادستی کے لئے

ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ کس دستور کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان کا دستوری نظام طے شدہ ہے کہ عدالیہ کی شریعت، یعنی عدالت شریعت کی جو تعمیر اختیار کرتی ہے قانون اس کو مانتا ہے۔ خواہ دستور میں اسلامی مباحث کا مسئلہ ہے تو اس میں بھی آخری فیصلہ عدالت کا ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم بحث کی خاطر مان لیں کہ پاکستان کا دستوری نظام پورے کا پورا اسلامی نہیں ہے تو اس کے بعد کا سوال یہ ہو گا کہ کیوں نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے اس سلسلے میں اپنی بنیادی رائے کو آخر میں پیش کروں گا کہ میری ناقص رائے آخر کیا ہے اور اس کا حل کیا ہے؟ مختصرًا میں آپ کے سامنے کچھ عرض گا۔ 1949ء میں جب قرارداد مقاصد دستور ساز اسلامی سے منظور ہوئی تو اس میں بہت سی دیگر باتوں کے ساتھ ہم نے پاکستان میں یہ مفروضہ مان لیا ہے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اس قرارداد کو بعد ازاں 1956، 1962، 1973 کے دساتیر میں بھی آئین کے دیباچے کے طور پر رکھ دیا گیا۔ دیباچے کی حیثیت کیا ہے؟ کیا متن میں اس کی کوئی حیثیت رہ جاتی ہے۔ یہ مباحثے عدالتوں کے سامنے آتے رہے ہیں۔ ان میں سب سے اہم مشہور کیس عاصمہ جیلانی بنام حکومت پنجاب 1972 کا کیس ہے۔ عاصمہ جیلانی جو، اب عاصمہ جہانگیر ہیں ان کے والد کو مارشل لاء حکومت نے گرفتار کیا تھا۔ بالآخر بات عدالت عالیہ سے عدالت عظمی تک گئی تو یہ سوال زیر بحث آیا کہ جس قانون کے تحت ان کو گرفتار کیا گیا، ہی ناجائز تھا۔ یہاں سے مسئلہ مارشل لاء کے نفاذ اور عدم نفاذ کی طرف گیا۔ دستور اس وقت معطل تھا۔ ایل ایف او، عبوری دستور تھا۔ عدالت عظمی کے نفل بینچ نے عاصمہ جیلانی کیس میں فیصلہ سنایا کہ مارشل لاء ہمارے سیاسی اور ریاستی نظام کی اساس کے خلاف ہے۔ اس اساسی نظام کیلئے انہوں نے جس دستاویز کو پیش کیا وہ قرارداد مقاصد تھی۔ اس قرارداد کو بنیادی حقیقت حاصل ہے۔ پورا ریاستی ڈھانچہ اس سے وجود میں آیا ہے اور اس میں مارشل لاء کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح سپریم کورٹ نے 1958ء کے فیصلے کے مطابق قرار دیا تھا کہ جب دستور معطل ہو گیا تو پھر ہم پیچھے کی بجائے آگے دیکھیں گے۔ اس فیصلے کو عدالت عظمی نے عاصمہ جیلانی کیس میں اور ٹرین کر دیا۔ اس فیصلے سے لگتا ہے کہ قرارداد مقاصد کو دستور سے بھی بالا دست حیثیت حاصل ہے۔ اس فیصلے کے بعد سول مارشل لاء ایڈمنیسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو کو مارشل لاء ختم کرنا پڑا۔ وہ صدارت کا عہدہ چھوڑ کر وزیر اعظم بنے۔ پھر نیا دستور بننا اور

اگست 1973 سے وہ نافذ ہوا۔ لیکن اگلے ہی سال سپریم کورٹ میں ایک نیا کیس سامنے آیا۔ خیاء الرحمن کیس میں سپریم کورٹ نے یہ قرار دیا کہ ایک جانب دستور کا متن ہے اور دوسری جانب دستور کا دیباچہ ہے اگر ان میں تعارض آجائے تو ہم دیباچے کو متن پر فوقيت نہیں دے سکتے۔ یعنی دستور کے نافذ العمل حصے پر عمل کیا جائے گا۔ جب 1985 میں آٹھویں ترمیم آئی تو اس میں دفعہ دو الف کا اضافہ کیا گیا اور اس کے تحت قرار دیا گیا کہ قرار داو مقاصد دستور کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح آئین کی باقی شقیں ہیں۔ اس طرح گویا پارلیمان نے عدیہ کے اس سوال کا جواب دیا کہ ہم دیباچے کو آئین کی شقوں پر فوقيت نہیں دے سکتے۔ پارلیمان نے قرار دیا کہ اب یہ دستور کا حصہ ہے۔ بظاہر اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اب آرٹیکل A-2 کی روشنی میں آئین کی تعبیر و تشریع کی جائے گی اور اگر کہیں دستور میں کوئی ایسی بات ہے جو آرٹیکل A-2 کے ساتھ متصادم ہے تو اس کو یوں سمجھا جائے گا کہ اس کو آرٹیکل A-2 کے ساتھ ہم اہنگ کیا جائے۔ لیکن عملاً جب یہ مسئلہ سپریم کورٹ کے سامنے رکھا گیا تو اس کا نتیجہ کچھ اور نکلا۔ اسلامی نظریاتی کونسل جو 1962ء میں اسلامی مشاورتی کونسل کے نام سے قائم کی گئی اور 1973 کے دستور میں اس کو اسلامی نظریاتی کونسل بنادیا گیا اسے کہا گیا کہ وہ پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی کو سفارشات دے اور اگر پارلیمنٹ چاہے تو اس سے بھی سفارشات طلب کر سکتی ہے۔ لیکن آرٹیکل 229 کا تقاضا ہے کہ اگر مفادِ عامہ کے تحت فوری قانون سازی کا معاملہ ہو تو پارلیمنٹ سفارشات کو دیکھے بغیر ہی قانون سازی کر سکتی ہے۔ سفارشات تو کئی بار پارلیمنٹ کو پیش کی گئیں مگر پارلیمنٹ نے آج تک ایک بار بھی ان سفارشات کا جائزہ نہیں لیا۔ کیونکہ اس پر کوئی دستوری پابندی نہیں کہ اگر آپ جائزہ نہیں لیں گے تو پھر کیا ہو گا۔ خیاء الحق نے یہ کیا کہ انھوں نے ہائی کورٹ میں شریعت بیتفہم بنائے جن کو یہ اختیار دیا کہ ایک جانب حدود کے مسئلے پر اپیل ہو گی تو وہ ہائی کورٹ میں شریعت بیتفہم کے سامنے آئے گی اور دوسرا کام یہ کہ اگر کوئی قانون شریعت سے متصادم ہو تو اسے کا لعدم قرار دیا جائے۔ چاروں ہائی کورٹ میں شریعت بیتفہم بنائیے گئے۔ پھر اگلے سال ان کو ختم کر کے ان کی جگہ وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی اور یہی اختیار اس کو دیا گیا مگر اس کے دائرہ کار سے آرٹیکل 203BC کے تحت چار چیزیں نکال دی گئی ان قوانین میں ایک تو دستور کو اس کے دائرہ کار سے باہر قرار دیا گیا دوسری چیز جو عدالتی فیصلے

سے متعلق تھی، تیسری چیز مسلم پرنسل لاء اور چوتھی چیز مالیاتی امور سے متعلق قوانین۔ ابتدائیں دو سال پھر چار سال اور آخر میں دس سال کا وقت لیا گیا کہ ہم ان قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کر لیں گے۔ یہ مدت 1990 میں ختم ہو گئی، اب تین طرح کے قوانین شریعت کورٹ کے اختیارات سے باہر ہیں، دستور، پرنسپرنسل لاء اور مسلم پرنسل لاء۔ لیکن اس سے کیا مراد ہے اور اس میں کیا کیا آتا ہے اور کیا نہیں آتا، مثال کے طور پر پہلے فرشتہ کیس میں 1980ء میں سپریم کورٹ نے مسلم پرنسل لاء کی جو تعریف معین کی اس کی رو سے مسلم فیملی لا ز آرڈیننس 1961 شریعت کورٹ کے اختیارات سے باہر تھا، لیکن 1993 میں ڈاکٹر محمود الرحمن فیصل کیس میں سپریم کورٹ نے ایک اور فیصلے میں جائزہ لینے کے بعد مسلم پرنسل لاء کی ایک اور تعریف دے دی کہ جس کی وجہ سے مسلم فیملی لا ز آرڈیننس 1961 کا جائزہ لینا شرعی عدالت کے لیے ممکن ہوا۔ 2000ء میں شرعی عدالت نے فیصلہ سنا دیا مگر اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائرہ ہو گئی۔ اپیل کا ایشو آیا تو میں وضاحت کروں معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کا جب فیصلہ آجائے تو دستور میں بھی یہ طے کیا گیا ہے اور سپریم کورٹ نے بھی مانا ہے اور یہ پاکستان کے دستوری اور قانونی نظام کا مسئلہ قاعدہ ہے کہ جب شریعت کورٹ نے اپنے مخصوص دائرہ عمل میں کوئی چیز شرعی ہے یا نہیں ہے اس میں کوئی فیصلہ سنا دیا اور پھر اس فیصلے کو سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنیٹ نے اور ٹرین نہیں کیا تو اس فیصلے کی پاسداری سپریم کورٹ پر بھی فرض ہے۔ یعنی اگر سپریم کورٹ کسی اور معاملے میں قصاص و دیت یا حدود کے معاملے پر جسے شریعت کورٹ نے پہلے ہی طے کر دیا ہو کہ شریعت یہ کہتی ہے تو سپریم کورٹ کے نج صاحبان اس معاملے میں نہیں جاتے کہ شریعت کہتی ہے یا نہیں کہتی ہے۔ کیونکہ وفاقی شرعی عدالت نے کہا کہتی ہے، سو کہتی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سپریم کورٹ کا ایک مخصوص بنیٹ، شریعت اپیلٹ بنیٹ، وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کو (جس کے نج ڈاکٹر خالد مسعود صاحب بھی ہیں) اور ٹرین کر دے تب حتی فیصلہ سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بنیٹ کا ہو جاتا ہے۔ ہمارے دستوری نظام میں دونوں دوستوری مفروضے ہیں، ایک یہ کہ موجودہ تمام قوانین کو ہم قرآن و سنت سے ہم آہنگ کریں گے دوسرا یہ کہ آئندہ کوئی قانون سازی قرآن و سنت سے متصادم نہیں ہو گی۔ یہ دو وعدے تینوں دستائر میں تھے۔ کئی کیسوں میں سپریم کورٹ نے یہ طے کیا مگر 1996ء کا

کیس بہت ہی اہم ہے ”ابجہاڈ فیڈریشن آف پاکستان“۔ اس میں سپریم کورٹ نے دستوری نظام کی چار بنیادی خصوصیات قرار دیں۔ ایک یہ کہ ہمارا دستوری نظام وفاقی، دوسرا یہ کہ پارلیمنٹی، تیسرا یہ کہ اسلامی اور چوتھا یہ کہ یہاں عدالت آزاد ہوگی۔ اس لیے انھوں نے یہاں تک کہا کہ اگر آئین میں کوئی ترمیم بھی ہو جائے جو اس کے بنیادی ڈھانچے کے خلاف ہو تو وہ بھی ناقابل قبول ہوگی۔ ماضی قریب میں سپریم کورٹ نے پارلیمان کو مجبور کیا کہ وہ جھوں کی تقریری کا طریقہ کار بدلے، اٹھارویں ترمیم میں جھوں کی تقریری کا جو طریقہ کار طے کیا گیا تھا وہ کیس سپریم کورٹ میں آیا تو سپریم کورٹ نے حتیٰ فیصلہ نہیں دیا مگر پارلیمنٹ کو کہہ دیا کہ اس کو تبدیل کر لیں۔ اس لیے پارلیمنٹ کو 19 ویں ترمیم اس بنیاد پر کرنی پڑی کہ سپریم کورٹ اس کو ختم کرنے والی تھی۔ جب یہ حالت ہوئی تو پھر مسئلہ کیا ہے پھر ہم کیوں کہتے ہیں کہ دستور پورے کا پورا اسلامی نہیں، اس میں کچھ ہونا چاہئے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ نہیں سے اصل مسئلہ سامنے آ جاتا ہے کہ ہماری سپریم کورٹ اور عدالتون نے دستور کی تعبیر و تشریح جس طرح کی ہے اس کو ایک طرح سے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ یعنی ہمارے دستور کی کچھ دفعات کو وہ اسلامی دفعات کہتے ہیں۔ اور اس کی تعبیر اسلامی کے شریعت کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی دستوری وضاحت کو غیر اسلامی یا غیر شرعی کے تناظر میں نہیں بلکہ وہ ان کو اسلامی دفعات کے طور پر دیکھتے ہیں نہیں۔ جب ان کی تشریح کو دیکھا جاتا ہے تو اس میں اسلام کے اصول و قواعد کیا ہیں وہ غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال آرٹیکل 248 ہے کہ صدر اور گورنر زکن کن امور میں عدالتی کا روائی سے مستثنی ہیں اگر اس مستثنی کی آپ جڑ کالیں تو وہ ریاست کی خود مختاری کا تصور ہے کہ ریاست اقتدار اعلیٰ کی حامل ہے اور صدر ریاست اسی اقتدار اعلیٰ کا نمائندہ ہے۔ عدالت کے سامنے این آراء کے کیسز میں بھی یہ مسئلہ اٹھا لیکن سپریم کورٹ اس معااملے میں گئی ہی نہیں۔ حالانکہ چوبڑی اعتزاز احسن نے کہا کہ اگر حضرت عمر فاروق عدالت میں آسکتے ہیں تو پوری مشرف کیوں نہیں آسکتے۔ لیکن عدالت نے اس نقطے کو لیا ہی نہیں۔ آرٹیکل 6 جو آج کل زیر بحث ہے یعنی سنکین غداری، اس سے کیا مراد ہے، ڈکشنری میں کیا ہے اور آئین کی دستاویز میں کیا ہے۔ یہ مباحث جاری ہیں لیکن اگر ہمارا دستور اسلامی ہے تو کیا غداری کے مسئلے پر شریعت میں کچھ نہیں ہے۔ یہ بحث عدالتون میں ہوتی ہی نہیں ہے۔ سپریم

کورٹ میں میڈیا پر عربی اور فاشی کا کیس زیرِالتوا ہے اور کافی عرصے سے اس پر کوئی فیصلہ نہیں آ رہا۔ سپریم کورٹ کہتی ہے کہ فاشی و عربی کی ذرا تعریف تو کریں۔ آرٹیکل 19 کے تحت آپ کو آزادی اظہار رائے کا حق حاصل ہے لیکن اس زمرے میں کیا آتا ہے؟ اور آخری بات جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ سپریم کورٹ بھی آج آگر دستورِ عمل دے دے کہ آج کے بعد پاکستان کے دستور کی تمام دفعات کی تشریع قرآن و سنت کی روشنی میں کی جائے گی تو میرے لیے تو پورے کا پورا دستور اسلامی ہو جائے گا۔ ہاں اس کے بعد یہ مسئلہ رہے گا کہ قرآن و سنت میں روشنی سے کیا مراد ہے؟ یعنی ہم نے تو دستور میں طے کیا ہے کہ احکام اسلام جو قرآن و سنت میں نہ کوہ ہیں لیکن نہ سپریم کورٹ نے نہ وفاقی شرعی عدالت نے نہ اسلامی نظریاتی کوسل نے آج تک کسی ایک معاملے میں بھی طبیب نہیں کیا کہ احکام اسلام سے کیا مراد ہے۔ یعنی جس کو ہم سینئر ڈر ز کے مطابق استعمال کر رہے ہیں وہ کیا ہے۔ یہ معاملہ کی بارشرعی عدالت میں آجاتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام ان کے سامنے امام ابوحنیفہ، امام شافعی، کی رائے یا ان کی تحقیق سامنے رکھتے ہیں۔ ججز کہتے ہیں کہ ہم تو قرآن و سنت کے پابند ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی آیت یا کوئی حدیث، لیکن جب یہ فیصلہ لکھنے پر آتے ہیں تو پھر ”ہدایہ“ سے ہدایتِ الجمہد، اور ”ردمختار“ سے بھی چیزیں آ جاتی ہیں۔ اگر پرکیش سینئر والاحل بھی ناقابل قبول ہے تو پھر تو یہ آزادی مارچ اور دھرنے جاری رہیں گے۔ پورا نظام ہی تبدیل کر لیتے ہیں، یعنی نیا پاکستان۔

خورشید ندیم کالم نگار و اینکر پاکستان ٹیلی و ویژن

اس ملک میں پہلے تو یہ طے کرنا پڑے گا کہ ریاست کیا ہوتی ہے۔ اس کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔ دوسرا سوال یہ کہ اگر ریاست ہوتی ہے تو حق اقتدار کن کو دیتی ہے وہ لوگ جو بندوق رکھتے ہیں اور طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہو جاتے ہیں ان کو دیتی ہے یا ان کو دیتی ہے جووراثت میں تاج رکھتے ہیں۔ یا پھر کسی ایسے طبقے کو دیتی ہے کہ جس کو عامۃ الناس کا بھیت مجموعی اعتماد حاصل ہوتا ہے۔ اسلام اور غیر اسلام کی بحث تو بعد کی بات ہے کہ پہلے ہم ان سوالوں

کے جواب دیکھیں۔ مثلاً ایک شخص جس کے پاس طاقت ہے وہ اقتدار پر قبضہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں کل سے اس ملک میں شریعت نافذ کروں گا تو کیا اس کے بعد اس کا حق اقتدار ثابت ہے کہ وہ ملک پر مسلط ہو جائے اور اس کا فرمایا ہوا قانون چلے گا۔ یا پھر فرض کریں کہ کل ایک گروہ جس کو اکثریت کی حمایت حاصل ہے وہ کہتا ہے کہ ہم آگئے ہیں۔ اب اس کے بعد کوئی اسلام اور کوئی غیر اسلام نہیں سادہ سامغربی جمہوریت کا نظام ہے جس کے تحت ہم ملک چلا کیں گے۔ یہ بنیادی سوالات ہم طے نہیں کر سکے۔ ہم 65 سال سے ان بنیادی سوالات سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ ہم اس تفہیم دین کے تناظر میں سوچتے ہیں کہ جس کی اساس وہ خلافت کا نظام ہے کہ جو اسلام کے اولین دور میں جاری رہا لیکن اس کو ایک ایسی قومی ریاست پر نافذ کرنا چاہتے ہیں جو دور جدید میں وجود میں آئی ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک لباس ہے لیکن جسم کے ناپ کا نہیں۔ لباس چھٹ کے آدمی کی قامت کا ہے مگر ہم اسے ساڑھے چارفت کے آدمی کو پہنانا چاہتے ہیں۔ جب ہم پہنانا دیتے تو اس کا مضمکہ خیز دکھائی دینا لازم ہے پھر ہم کبھی اس کی قمیں کو نیچے سے کاٹتے ہیں پھر ہم چاہتے ہیں کہ اس کا گلاسترہ اچھا کا ہے اس کو کاٹ کر فٹ کر لیں۔ اس طرح کاٹ کاٹ کر اس کی شکل مزید مضمکہ خیز ہو جاتی ہے چنانچہ ہم جیتے قومی ریاست میں ہیں اس پر چودہ سو سال پہلے کے دور خلافت کا نمونہ لانا چاہتے ہیں جبکہ وہ دور اور تھا اور اس کے مذہبی تقاضے اور تھے۔ اس کے لیے ہم مثالیں اور نظائر لاتے ہیں اور پھر وہ ایک نیا نمونہ لاتا ہے۔ جیسے طالبان کا نظام انصاف ہے صبح کیس لگتا ہے شام کو فیصلہ آ جاتا ہے۔ یا ایک ایسا بالادہ ہے جو ہم ایک ایسی ریاست کو پہنانا چاہتے ہیں جو اس کے لیے بنی ہی نہیں ہے۔ اس کا ایک نظام ہے جس میں قاضی کا کام قانون بنانا نہیں ہے۔ عدیہ اس کو نافذ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بد قسمتی سے جو علماء اس مجبوری اور عدالتی نظام کو قبول کرتے ہیں وہ بھی جب نفاذ کا وقت آتا ہے تو اسی قدیم نمونے کے زیر اثر سوچتے ہیں۔ اس میں قانون سازی کا اختیار مفہمنہ کے پاس نہیں علماء کے پاس ہے۔ قرآن کیا ہے وہ کیا جاہتا ہے اس کا واحد حق صرف علماء کے پاس ہے اس پر علماء کی اجرہ داری ہے وہ اگر طے کر دیں کہ حدود کے مقدمے میں عورت کی گواہی قبول نہیں تو نہیں قبول، اگر حدود میں غیر مسلم کی گواہی قبول نہیں ہے تو نہیں قبول۔ مشرف جیسے سیکولر لوگ بھی جب

ان کے سامنے خواتین کے حقوق کا مسئلہ آیا تو انھوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو بھی ایک طرف رکھا۔ علماء کے کچھ نمائندے چوہری شجاعت کی مدد سے آئے انھوں نے طے کیا کہ یہ ہے دین، جس کے بعد اس بل کو نافذ کر دیا گیا۔ حالانکہ پارلیمنٹ میں بیٹھے علماء نے اس بل کو نہیں مانا کہ یہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ آپ کے جمہوری نظام کے تحت ایک خاتون ملک کی وزیر اعظم بن سکتی ہے ہمارے تفہیم دین کے تحت تو نہیں بن سکتی۔ یہ سارے تضادات اس لیے پیدا ہو رہے ہیں کہ ہم بہت بغاوتی چیزیں طے نہیں کر سکے۔ جو چیز تاریخ کے جر کے تحت ہم اختیار کر لیتے ہیں اس کو ہم کیوں نہیں پورے علم اور ادارک کے ساتھ قبول کرتے اور اس کو اپنی مرضی سے کوئی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً تصویر آج بھی بالجماع حرام ہے مگر عملاً یا جماع ختم ہو چکا۔ اب تو عرسوں کے اشتہارات بھی با تصویر شائع ہوتے ہیں، مولانا فضل الرحمن اور سراج الحق صاحب کوئی جلسہ بغیر کبرے کے کر کے دکھائیں۔ فتویٰ ابھی بھی موجود ہے کہ تصویر حرام ہے۔ خواتین کے سیاسی کردار کے حوالے سے فتویٰ اور ہے اور عمل اور ہے۔ آپ کے ملک میں سزاۓ موت پر پابندی ہے لیکن عالمی حالات کے تناظر میں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ اس کو نافذ نہیں کر سکتے۔ رسالت ما بُ نے مدینہ کی جس ریاست کی بنیاد رکھی۔ وہ بالکل اور ہے اس ریاست سے جس کی بنیاد سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے رکھی۔ میثاق مدینہ کے خدو خال بالکل اور تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا سماجی منظر نامہ مختلف تھا اس کے اندر یہودی بھی امت کا حصہ تھے لیکن سیدنا ابو بکر صدیقؓ جس ریاست کی بنیاد رکھ رہے تھے وہ غالباً مسلمانوں کی ریاست تھی۔ حضرت ابو بکرؓ کے بعد جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہیں کہا گیا کہ آپ حضرت عمرؓ کے فیصلوں کو قبول کریں گے انھوں نے کہا کہ بالکل کریں گے۔ اس کے بعد جب حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کا فیصلہ ہونے لگا تو کمیٹی نے یہ سوال حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے سامنے رکھا کہ آپ قرآن و سنت کے بعد شیخین کے نظائر کو بھی قبول کریں گے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ میں تو قبول نہیں کروں گا۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں بھی ایک خیال یہ تھا کہ شیخین کے نظائر کو ان کے دور تک ایک حیثیت حاصل ہے ان کو ایک مستقل مأخذ قانون نہیں بناسکتے۔ یہ جو آج کے حالات کا تناظر ہے، ایک مقامی اور دوسرا عالمی، اُس کا ادارک کئے بغیر جب ہم کسی اسلامی ریاست کا

خواب یا تصور دیکھتے ہیں تو وہ سارے مسئلے پیدا ہوتے ہیں جس کی طرف قبل ازیں اہل علم نے اشارہ کیا ہے۔

سوالات و جوابات

سوال

محمد عرفان، متعلم جامعہ غوثیہ

کیا حدود آرڈیننس اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے، اس حوالے سے بہت سارے ابہامات جنم لے رہے ہیں، اگر اس کی وضاحت کردی جائے تو تشفی ہو جائے گی۔

جواب:

ڈاکٹر خالد مسعود، سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل

حدود پر قوانین 1979 میں بن گئے تھے اور ان پر عمل درآمد بھی ہوتا رہا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ حدود پر قانون سازی نہیں ہوئی تھی۔ فقہ کی کتابوں سے چیزیں لی گئی تھیں۔ چونکہ فقہ میں حدود اور تعزیر میں فرق ہے انہوں نے تعزیر والی شقیں بھی حدود آرڈیننس میں شامل کر دی تھیں اور کہا تھا کہ یہ حدود کے مطابق ہے اور یہ تعزیر کے مطابق ہے اور پھر کئی سال تجوہ ہوئے اور وقتیں ہوئیں اس پر علماء اور ہمارے قانون دانوں نے بہت سارے نکات اٹھائے۔ جب میں چیئرمین تھا تو ہم نے ان پر نظر ثانی کی۔ اس زمانے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی متفقہ رائے تھی کہ اس پر قانون پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ہم نے حکومت کو سفارش پیش کی اس پر بحث شروع ہوئی اس کو سیاسی انداز سے حل کرنے کی کوشش ہوئی، علماء کی کمیٹی بنائی گئی، ڈرافت بناء، صرف دو امور اس میں سے لئے گئے، زنا اور قذاف کا۔ ان پر بنیادی طور پر جو سوالات اٹھائے گئے تھے۔ کیونکہ علماء کا کہنا تھا کہ زنا بالجبرا اور زنا بالرضاد و نوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عورت نے دوسرے پر الزام لگاتے ہوئے کم از کم یہ بات مان لی کہ وہ بھی گناہ میں شامل تھی اس لیے وہ بھی سزا کے قابل ہے۔ اس پر بحث نہیں ہو سکی۔ چنانچہ وہ خواتین جوزنا کی شکایت لے کر آئی تھی وہ جیل میں گئیں۔ کیونکہ اس الزام کو ثابت بھی خاتون نے کرنا تھا اور پرویجرل طریقہ ناقص تھا۔ میرے

خیال میں قرآن مجید میں چار گواہوں کا ذکر ہے وہ ان کے لیے ہے جو مصنات پر الزمam لگائیں یعنی اگر چار سے گواہ کم ہوں تو وہ بہت بڑا الزمam لگا رہے ہیں وہ ناکافی ہو گا۔ ہم نے فقہ میں بھی اس کا پرویسیجر بنادیا، زنا بالرضاء کا بھی اور زنا بالجبر کا بھی۔ جو بے چاری شکایت لے کر آئی تھی اس کے ذمہ ہو گیا کہ وہ زنا کو ثابت کرے کیونکہ وہ الزمam لگا رہی ہے جو اس کے لیے بہت مشکل تھا پھر اس میں جو ترمیم ہوئی اس میں اچھی بات یہ ہوئی کہ حدود آرڈیننس میں حدود تعزیر دونوں اکٹھے تھے، اور ان کے لیے پرویسیجر صرف حدود کا چلتا تھا، تعزیر کے جتنے بھی قوانین تھے انھوں نے ہٹا کر تعزیرات میں ڈال دیئے، حدود کے قوانین اُسی طرح حدود آرڈیننس میں رہے۔ ویمن پروپیکشن ایکٹ میں اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آج تک حدود آرڈیننس کا کسی نے مطالعہ نہیں کیا سب یہی کہتے ہیں یہ اسلامی نہیں۔ اس میں رجم کی جو سزا ہے اس میں لکھا ہوا ہے کہ جب پھر مارنا شروع کریں گے تو ایک سپاہی گولی مارے گا اور جب گولی لگے گی تو لوگ پھر مارنا بند کر دیں گے۔ یہ کون سی فقہ کی کتاب سے لیا گیا ہے اس کو سب علماء کہتے ہیں یہ صحیح ہے۔ یہ جناب محمد معروف دواليٰ صاحب کی ترمیم تھی سیدھا سادھا کہتے کہ ہم سنگ باری کو اچھا نہیں سمجھتے اس لیے ہم اس کو فائزگر سکواڑ کے سامنے رکھ کر پھانسی دے رہے ہیں۔ دوسرا یہ کہ خورشید نہیں صاحب نے ابہام کا تذکرہ کیا ہم اگر سمجھ لیں کہ ایک طرف فقہ ہے اور ایک طرف عام قانون ہے، یہ برش کامن لا اور فقہ کے درمیان کی بحث ہے۔ فقہ میں بھی جو بحث پاکستان میں ہے وہ قرآن و سنت کی نہیں ہے یہ بحث فرقہ وارانہ ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ اختیار کس کو ہے کہ اس کی تعبیر کون کرے۔ بنیادی طور پر یہ کہ اقتدار کس کے پاس ہو۔ میرا خیال ہے کہ اسلامی فقہ کی تاریخی طور پر ابتداء ہوئی ہی اسی لئے ہے کہ تب اموی اور عباسی حکمران قاضیوں کے معاملات میں دخل دیتے تھے اس کے لیے فقہ کو ایک پرائیویٹ قانون کے طور پر بنایا گیا۔ اس میں حکومت کا یارکیں کا کیا حصہ ہو گا وہ اس میں نہیں ہے، ریاست صرف اس کو نافذ کرے گی، اس کی تعبیر فقہا کریں گے۔ یہ ایک متبادل قانون تھا جو صرف ان چیزوں پر بنایا جس کی رہنمائی قرآن و سنت میں موجود تھی باقی سب چیزوں کو تعزیر میں ڈال دیا اور اس کے لیے ریاست کے سامنے کھلامیدان چھوڑ دیا۔ علماء کا کہنا ہے کہ فقہ پر بات پاریمنٹ کر سکتی ہے نہ کوئی اور، صرف علماء کر سکتے ہیں۔ وہ آخر کا ایک علمی بحث نہیں رہتی وہ سیاسی اور اقتدار

کی بحث بن جاتی ہے اور جب تک ہم اس کو طے نہ کر لیں۔ علماء کا ایک ذہن بن ہوا ہے کہ ساری طرف ان کے دشمن ہیں اور ہم پر سارے تلے ہوئے ہیں ایک سیکولر طبقہ ہے ایک فلاں طبقہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ان کے ساتھ بیٹھ کر کھل کر بات کرنی ہوگی۔ ہمیں مطالعہ کرنا ہوگا۔ ہم صرف ایک حد تک مطالعہ کر کے رائے بنایتے ہیں یہ بن المذاہب اور مختلف فرقوں کے حوالے سے دلائل کا جائزہ لیا جائے تو پھر ہمارے ذہن سے یہ بات ختم ہو جائے کہ یہ کفر کی طرف لے جاتا ہے یا فتنہ کی طرف لے جاتا ہے بلکہ ہمیں خوشی ہو کہ یہ سب لوگ قرآن و سنت کی ہی تعبیر و تشریع کر رہے تھے۔ ان سے اختلاف ہو سکتا ہے اور اس اختلاف کو اجماع کی شکل میں بھی لایا جاسکتا ہے کہ بنیادی طور پر ہمارے اصول ایک ہیں۔

سوال۔

سلیمان عارف، جامعہ محمدیہ اسلامیہ
اسلامی ریاست اور معاشرے کے لئے آئینہ میں دور کون سا ہے، بالخصوص اگر ہمارے ذہن میں رسالت مابھی کی اور مدنی زندگی دونوں پیش نظر ہوں۔

جواب

خورشید ندیم:

پہلا سوال جو آپ نے کیا اگر ناسخ اور منسوخ کی بحث سامنے رکھیں تو اس سوال کا جواب آپ کوں جائے گا۔ ہمیں اس خیال سے اتفاق ہے کہ جب دین مکمل ہو گیا اور حتیٰ چیزیں سامنے آگئیں تو اس کے بعد جو پرانے نظائر ہیں ہمارے لیے جست نہیں رہے۔ قرآن و مجید کے اندر ناسخ و منسوخ کی بحث جو اہل فقیر آج تک کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ جو جہاد کی آیات آئیں خاص طور پر سورۃ توبہ کی، اس کے بعد جو صبر کی آیات ہیں وہ منسوخ تصویر کی جائیں، اس کے بعد کافروں کے ساتھ بختی سے معاملہ کرو یعنی جب آپ کے پاس طاقت آگئی تو صبر کی آیات منسوخ ہو گئیں یہ بات آپ کو ناسخ و منسوخ کی بحث میں سب تعبیروں میں ملے گی، اس میں لوگ کہتے ہیں کہ جب دین مکمل ہو گیا تو اس کے بعد بیشاق مدینہ والا ماؤں منسوخ ہو گیا اور وہ قابل قبول نہیں رہا۔ جب اسوہ حسنہ کی بات ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ جب دین مکمل ہو گیا تو اب

پرانے نظائر قابل قبول نہیں ہیں۔ آج کے دور میں بہت سارے علماء اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ دین سارے کا سارا اور سارا قرآن و سنت آپ کے لیے مثال اور آپ کے لیے اسوہ حسنہ ہے۔ ایک تکشیری معاشرے میں آپ کو کیسے جینا چاہئے اس کی مثال آپ کو میثاق مدینہ میں ملے گی۔ اگر آپ ایک تکشیری معاشرے میں رہ رہے ہیں تو یہ آج بھی نافذ العمل ہوگی۔ اگر آپ کسی ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جس میں آپ کے پاس طاقت نہیں اور آپ کمزور ہیں تو پھر آپ کے لیے مکہ کا ماؤں ہے کہ جب رسالت مآب کے پاس اقتدار نہیں تھا اس لیے وہاں نافذ دین کے لیے کوئی اجتماعی مہم نہیں چلی یہ ساری چیزیں بعد میں ہوئیں جب مدینہ کی ریاست آگئی۔ آج بھی اہل علم مکہ کے اور مدینہ کے ماؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ بالخصوص آج کے دور میں جب لوگوں نے کسب معاش کے لیے بڑی تعداد میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت کی تو اس میں نئے نئے مسائل پیدا ہوئے۔ فقه العقلیات نے جنم لیا۔ میں تو اس کو صحیح سمجھتا ہوں کہ ایک تکشیری معاشرے میں آج بھی رسالت مآب کی وہی سنت قابل قبول ہونی چاہئے جو میثاق مدینہ کے تناظر میں ہے۔ دوسرا یہ کہ میں کہتا ہوں کہ ہمارے پاس کپڑا بھی ہے اور دھاگہ بھی تو پھر اپنا لباس اپنی قامت کے مطابق بنانا چاہئے۔ نہ کہ خلافت کا وہ لبادہ جو چودہ سو سال پہلے کے تقاضوں کے مطابق تھا اسے اپنا میں اور مٹھکہ خیز لگانے لگیں۔ اصول آپ اسلام سے لیں مگر ستم ہر دور کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے۔ اسلام کا کوئی ایک نظام نہیں وہ زمان و مکان کی قید سے مشروط ہے اور بدلتا رہے گا۔ ایک وقت میں وہ کئی ہو سکتے ہیں جیسے کہ آج کے دور میں سو ڈان میں اسلامی ریاست کچھ اور طرح کی ہے سعوی عرب میں کچھ اور ایران میں اور اور طالبان کی اور طرح کی ہے۔ یعنی کپڑا اور دھاگہ وہیں سے لے کر اپنی ترجیحات کے مطابق لباس بنالیں اس کو ہم اجتہاد کہتے ہیں۔ مسلمات کے ساتھ ساتھ نصوص میں بھی غور و فکر کی روایت کو ہی آگے بڑھانا پڑے گا۔

مکالمہ چہارم (قومی)

تاریخ: 22 اکتوبر، 2014

بمقام: اسلام آباد

صدرات: خورشید احمد ندیم۔ مذہبی سکالروائیں کر پاکستان ٹیلی و ڈیشن

محرك بحث: ڈاکٹر قبلہ ایاز، واکس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

میزبان: محمد عامر رانا، ڈاکٹر یکیٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز اسلام آباد

شرکاء گفتگو

مولانا عبدالحق ہاشمی، مذہبی سکالرومبرائیڈ وائزری کونسل جماعت اسلامی۔ کوئٹہ

ڈاکٹر شیداحمد، اسٹینٹ پروفیسر شیخ زید اسلام کمپسینٹر پشاور

صاحبزادہ محمد امامت رسول، پرنسپل ادارہ فکر جدید و ایڈیٹر ماہنامہ روح بلند لاہور

مولانا سید احمد بنوری، معلم جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مفتش محمد زاہد، واکس پرنسپل جامعہ امدادیہ فیصل آباد

مولانا یسین ظفر، پرنسپل جامعہ سلفیہ فیصل آباد ویکرٹی جزل و فاق المدارس سلفیہ

مولانا عمار خان ناصر، ڈپل ڈاکٹر یکیٹر الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ

ڈاکٹر ابیاز صمدانی، جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی

عطاء اللہ شہاب، بمبرنا درن ایریا کونسل ورہنمایمیت علامے اسلام گلگت بلتستان

مولانا محمد شفیع چترالی، مذہبی سکالروکالم نگار روزنامہ اسلام کراچی

ڈاکٹر ثاقب اکبر، ڈاکٹر یکیٹر اخوت اکیڈمی اسلام آباد

اسلام آباد میں منعقدہ قومی مبارحت کے شرکاء



خطبہ استقبالیہ

محمد عامر رانا، میزبان

ڈاکٹر کیثر پاک انسٹی ٹیوٹ فارمیس سٹڈیز

یہ اپنے سلسلے کا آخری پروگرام ہے اس سے قبل اس طرح کی فکری نشستیں، کراچی، لاہور،نجیب پختونخواہ اور اسلام آباد میں ہو چکی ہیں، ان نشتوں کی غرض و غایت کیا ہے اور ان کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کی وضاحت ہم پہلے کر چکے ہیں۔ جب ہم نے یہ مکالمہ شروع کیا تو اس وقت پاکستان کی نظری صورتحال قدرے مختلف تھی، غیر ریاستی عناصر کی جانب سے ایک چلنچ درپیش تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر ایک بھرپور فکری مکالے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے یہ کوشش کی۔ آج کے حالات میں اگرچہ اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ چکی ہے اس لئے ہماری آپ سے گزارش ہو گی کہ موجودہ سیاسی اور نظری حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہماری رہنمائی فرمائیں اور ان سوالوں کے جواب دیں جو اس سے قبل کی نشتوں میں اٹھائے گئے ہیں۔ میں آج کے صاحبِ صدر خورشید ندیم سے گزارش کروں گا کہ وہ آج کے مکالے کو آگے بڑھائیں۔

خورشید احمد ندیم: صاحبِ صدر

ندیمی سکالر، کالم نگار، اینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن

چونکہ آج کی نشست اس سلسلے کی آخری کڑی ہے اس سے قبل مختلف شہروں میں اس طرح کی نشستیں ہو چکی ہیں۔ چنانچہ ہماری خواہش ہو گی کہ ہم گزشتہ نشتوں کے حاصل کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھائیں، اس کے لئے اگر ہمارے ذہنوں میں کچھ پس منظر بھی تازہ ہو جائے کی یہ ساری بحث اب کس موڑ پہنچ چکی ہے تو ہم بات کو زیادہ بہتر طریقے سے آگے بڑھائیں گے، اس سلسلے میں، میں ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ گزشتہ کارروائی کو ہمارے سامنے رکھیں تاکہ مزید گفتگو کی جاسکے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز

وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

زمانہ قدیم سے ہی مختلف معاشرے اپنا نظم و نتیجہ چلانے کی کوشش کرتے رہے۔ موجودہ زمانے میں جمہوریت کا تصور یونانی معاشرے سے آیا۔ عربوں میں رسول اکرمؐ کی بخشش سے پہلے یہ تصور موجود تھا کہ ان کے بڑے اکٹھے ہو کر معاشرتی نظم و نتیجہ کے فصلے کرتے تھے۔ اس سلسلے میں قبیلہ قریش کو سیادت حاصل تھی۔ رسول اکرمؐ نے قرآن و سنت کی روشنی میں شورائیت کا تصور دیا، خلافت را شدہ میں بھی اس کی ایک جملک نظر آتی ہے۔ بعد میں جب شہنشاہیت اور خاندانی حکومتیں آئیں تو اس میں بھی ہمارے اہل فکر یہ سوالات اٹھاتے رہے کہ استبدال حکومت کیسے ہو؟ امام الماوردی، الفارابی جیسے جید علماء نے ان موضوعات پر تفصیل کے ساتھ کتابیں لکھیں، جن میں ”الاحکام سلطانیہ“، ”حکومت الشریعہ“ وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؓ کی تو پوری ایک فکر ہے، احتجاج کس طریقے سے ہو، انتقال حکومت کیسے ہو، فتوؤں سے کیسے بچا جائے۔ جب عرب اور بر صغیر میں غیر ملکی حکومتیں آئیں تو دین دار طبقے نے آزادی کی تحریکیں سیاسی اور فوجی حاذوں پر چلانیں۔ پاکستان بننے کے بعد ایک موقع ایسا بھی آیا جب تعلیم یافتہ لوگوں کی نہیں اور سیاسی جماعت، جماعت اسلامی میں خود مودودی صاحب کی زندگی میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ جمہوریت اور انتخابات کا حصہ بن جائے یا نہیں۔ جو لوگ اس پر یقین نہیں رکھتے تھے وہ لوگ جماعت سے الگ ہو گئے اور اپنی علیحدہ تنظیمیں بنا دیں۔ جبکہ کچھ علماء نے جمہوری اور سیاسی انداز اختیار کیا اور آئین سازی کا حصہ بھی بنے۔ دوسری طرف القائدہ، داعش، طالبان اور انصار الاسلام جیسی تنظیمیں بھی ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ جمہوری اور دستوری طریقے سے نہ تبدیلی آسکتی ہے نہ ہی اسلامی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ داعش نے حال ہی میں خلافت کا اعلان کر کے ابو بکر بغدادی کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور انہوں نے افتتح کے نام سے اپنے پوغلٹ پشاور میں افغان مہاجرین کے کیمپوں میں بھی تقسیم کئے ہیں۔ اس سے قبل افغانستان میں بھی طالبان نے اقتدار پر قبضہ کر کے حکومت قائم کی اور جوان سے متفق نہیں تھا اس کو بااغی قرار دے کر اسلامی فقہ کے تحت سزا آئیں بھی دیں۔ آج کل دھرنے کی سیاست میں بھی بھی سوال سامنے آ رہا ہے کہ پارلیمنٹ سے کوئی تبدیلی نہیں

آسکتی۔ چنانچہ آج کا موضوع یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس پر پوری دلجمی کے ساتھ سوچ بچار کریں تاکہ اپنی آئندہ نسلوں کو کوئی متفقہ لائچہ عمل دے سکیں۔

صاحبزادہ امامت رسول

پرنسپل ادارہ فکر جدید، مدیر ماہنامہ فکر بلند لاہور

ہمارے ہاں آج کل جہاد کے ذریعے اسلام نافذ کرنے یا خلافت نافذ کرنے کی تحریکیں چل رہی ہیں حالانکہ اسلام نے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ مشاورت ہے۔ اس کو نظر انداز کر کے جو تبدیلی لانے کی کوشش ہو رہی ہے اس سے صرف فساد اور تخریب ہی برآمد ہو رہی ہے۔ عوام کی رائے کو نظر انداز کر کے ہم اسلام نافذ نہیں کر سکتے۔ اسلام نے اپنے اجتماعی معاملات میں لوگوں کو شریک کرنے پر زور دیا ہے۔ مسلم معاشرے میں اس بات کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی کوئی جماعت تفرقے کی بنیاد پر چاہے وہ مذہبی ہو، لسانی یا علاقائی ہو کی بنیاد پر قائم ہو۔ اگر آپ امتِ واحدہ کا حصہ ہیں تو مذہبی طور پر آپ کو اپنی رائے دینے کا الحق ہے مگر اسے دوسروں پر تھوپا نہیں جاسکتا۔ سیاسی معاملات میں مرد عورت کو بلا تفریق رائے دہی کا حق حاصل ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مرد کے مقابلے پر عورت ان معاملات میں زیادہ فعال نہیں ہے۔ ہمارے لوگ تبدیلی کے لئے تدریجی عمل کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم آئین کی دفعہ 62 اور 63 کی بات کرتے ہیں مگر جو جمیع صورت حال ہے کیا اس میں ایسے لوگ برسراقت در آسکتے ہیں جو شعار اسلام کے ساتھ ساتھ ہماری قیادت کے بھی اہل ہوں۔ چنانچہ آپ تدریجی عمل کو نظر انداز کر کے اسلام کو نافذ نہیں کر سکتے۔ یا ایک حقیقت ہے کہ پچھلے دو تین سو سال سے ہمارے ہاں فکر و فلسفہ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی، اگر کوئی کام ہوا بھی ہے تو اس کی حیثیت انفرادی ہے۔ آج کی دنیا میں مغربی فلسفے کا غالبہ ہے اور ہمارے پڑھے لکھے لوگ یہاں رہنا ہی نہیں چاہتے تو پھر فکری اور تحقیقی کام کیسے ہو گا؟ آپ یہاں بیٹھ کر مغرب کے خلاف جو مرضی بولیں، جمہوریت کے خلاف بات کریں مگر ہمارا اس وقت تک مغرب کے ساتھ مقابله نہیں ہو سکتا جب تک ہم فکر و فلسفہ میں ترقی نہ کریں۔ جب ہماری فکر مظبوط ہوگی تو خود بخود بہتری آئے گی۔

مولانا سید احمد بنوری

معلم جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

ہمارے وہ نوجوان جو مسلم جدوجہد کو ضروری سمجھتے ہیں اب ان کا رخ خارج کی طرف نہیں بلکہ داخل کی جانب ہے انھیں اس بات پر یقین ہے کہ اصل مسئلہ مغرب نہیں بلکہ خود مسلم معاشرے ہیں جو کفر کا شکار ہو چکے ہیں اس لئے پہلے ان کو تبدیل کرنا چاہئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان میں بزرگ طبقہ بھی اس نظام کے بارے میں یہ رائے رکھتا ہے کہ یہ میں کچھ نہیں دیتا بلکہ اب تو خانقاہی حلقة بھی اس کے خلاف ہو چکے ہیں۔

جمهوریت ہونی چاہئے یا نہیں، میرے نزدیک اہم یہ ہے کہ اسلام اس سوال کو کہاں پر دیکھتا ہے۔ میرے نزدیک سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کا انتخاب ہم خود کریں گے یا کوئی ہمیں کر کے دے گا۔ کیا یہ فیصلہ برابری کی بنیاد پر ہو گا یا کسی کی رائے کو کسی کی رائے پر فوکس ہو گی۔ فتحی استدلال میں، میں قدیم علماء کی رائے کو متعین صحبتا ہوں کہ جنہوں نے حضور نبی کریمؐ کے بعد آنے والے مسائل کی بنیاد بنا دیا کہ خلافت منصوص ہوتی ہے یا یہ فیصلہ عامۃ الناس کرے گی۔ اسی مسئلے پر مسلمانوں میں پہلی تقسیم ہوتی علمائے اہل سنت کا کہنا تھا کہ یہ فیصلہ عوام نے کرنا ہے۔ وہ استدلال جو اس نظام سے نفرت کی بنیاد بنے وہ یہ ہے کہ دین کا مطالبه اطاعت یا عبودیت ہے دین نے لازم کیا ہے کہ انسان خدا کے آگے سر جھکائے جبکہ جمہوریت یہ کہتی ہے کہ انسان اپنی رائے دے۔ ہمارے ہاں فکری طور پر اس کو شدید مخاصے کی وجہ بنا دی گئی ہے کہ جمہوریت یہ کہتی ہے کہ انسان اپنی رائے ظاہر کرے جبکہ مسلمان اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتا وہ بہر کیف خدا کی رائے کا پابند ہے۔ اگر انسان کی رائے کو اہمیت دی گئی تو وہ بنیادی طور پر شرکوپسند کرنے والا ہے اس لئے اس کے جو جی میں آئے گا کرے گا۔ میں صحبتا ہوں اس فکری مغالطے کو دور کرنا بہت ضروری ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ انسان کو دنیا میں لانے کے بعد خدا نے تو اس سے یہی مطالbeh کیا کہ وہ اطاعت کا مظاہرہ کرے، لیکن خدا یہ چاہتا ہے کہ اس کا بندہ عبد بنے طاغوت نہ بنے۔ چنانچہ یہ نہیں کہ انسان عبدیت اختیار کرے اور حریت چھوڑ دے۔ خدا کا مطالbeh دنیا میں بندے سے یہی ہے کہ وہ خدا کی بات کو تسلیم کرے لیکن کرے اپنی مرضی سے۔ اگر آپ

اس کی مرضی سلب کریں گے تو آپ اس کو مکلف ہی نہیں بناتے کہ وہ خدا کی دنیا میں زندہ رہ سکے۔ آدم کے وقت جب مکالمہ ہوا اور ابلیس نے خدا سے اذن چاہا کہ میں دنیا میں آدم کو گراہ کروں گا تو خدا نے پوری شان استغفاری سے اس کو اجازت دے دی اور کہا کہ جو تمہاری مانے گا وہ اخروی طور پر بتاہ ہو گا اور جو میری مانے گا وہ اخروی طور پر کامیاب ہو گا۔

واللیل نے ایک تاریخی جملہ کہا تھا کہ میں تمہارا مخالف ہوں مگر تمہارے حق تقدیم کے لئے اپنی جان دیتا ہوں۔ میں دینی طالب علم کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ حق ایک ہے اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی ماننا چاہئے لیکن بہر کیف ماننا اپنی مرضی سے چاہئے۔ اس کے بعد جمہوریت پر اعتراض کی بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر رشید احمد:

اسٹینٹ پروفیسر شیخ زید اسلامک سینٹر پشاور یونیورسٹی

جب ہم مغربی جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو اس کے مقابلے پر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ کیا سلامی جمہوریت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ آئین پاکستان کا جمہوری ہونا مسلم ہے مگر اس کا اطلاق کہیں نظر نہیں آتا، اسی طرح اسلام کا مزاوج جمہوری ہے مگر مسلمانوں کو دیکھا جائے تو یہ کہیں نظر نہیں آتا۔ ریاست کے حوالے سے ہمارے فقہاء نے دولتِ اسلامیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جبکہ جدید ریاست کے چار عناصر آبادی، علاقہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ بیان کئے جاتے ہیں جب ہم اس لحاظ سے اسلامی ریاست کو دیکھیں گے تو پھر ان سب عناصر کو الگ الگ دیکھنا پڑے گا کہ کیا اس طرح کوئی ریاست اسلامی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ جمہوریت پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ اس میں اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس ہوتا ہے مگر اسلامی ریاست میں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اسلام میں ریاست اور مذہب کو الگ الگ نہیں دیکھا گیا مگر جمہوریت میں یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ جمہوریت قوم پرست کو فروع دیتی ہے جس سے تفرقہ جنم لیتا ہے اسلام کی قسم کے تفرقے کے خلاف ہے۔ پارٹی سٹم اور حزب اختلاف کا بھی اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ اگرچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریمؐ کے وصال کے بعد تین گروہ بن گئے تھے جنھیں اس وقت کی پارٹیاں کہا

جاسکتا ہے ایک گروہ انصار کا تھا جو سعد بن عبادہؓ کی قیادت میں سرگرم تھا، دوسرا قریش کا تھا جس کی قیادت حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کر رہے تھے۔ تیراً گروپ بنوہاشم کا تھا جس کی قیادت حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے پاس تھی۔ جمہوریت میں قانون سازی کا حق پارلیمنٹ کو حاصل ہے مگر اسلام میں صرف شوریٰ ہی قرآن و سنت کی روشنی میں محدود قانون سازی کا حق رکھتی ہے۔ جمہوریت میں ہر فرد کو حق رائے دہی حاصل ہے مگر اسلام یہ حق ہر کسی کو نہیں دیتا۔ موجودہ حالات کو دیکھا جائے تو داعش، القائدہ، الشاباب، حزب التحریر اور طالبان مسلح جدو جہد پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مقابلے پر مصر کی الاخوان، پاکستان کی جماعت اسلامی، تجمعیت علمائے اسلام وغیرہ سیاسی جدو جہد کرنے والی ہیں تاکہ اس ذریعے سے اسلام کو نافذ کیا جاسکے۔ شنہاں جب مالٹا سے واپس آئے تو انہوں نے بھی مسلح جدو جہد کا راستہ ترک کر دیا تھا۔ اس میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں موجودہ حالات کے تناظر میں یہ دیکھنا ہو گا کہ لوگ مسلح جدو جہد کی طرف کیوں مائل ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز صمدانی

جامعہ دارالعلوم کو رنگی کراچی

اسلام نے حکومت سازی کے اصول دیئے ہیں لیکن ان میں قابل ترجیح کون سے ہو سکتے ہیں اور قابل قبول کون سے۔ اسی طرح جب کوئی حکومت قائم ہو جاتی ہے تو استبدال حکومت کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ خلافت کے لئے کوئی ایک طریقہ ہمارے سامنے موجود نہیں چاروں خلافاء الگ الگ طریقے سے اقتدار میں آئے۔ جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے آپ کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن خلیفہ کے لئے عمومی رائے کا داخل ضرور رہا ہے فرق صرف یہ ہے کہ پہلے اصحاب الرائے اس کو منتخب کرتے ہیں اور اس کے بعد عام لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کی تائید کرتے ہیں۔ کچھ کچھ پارلیمانی نظام میں بھی ایسا ہے کہ کچھ لوگ آپ منتخب کرتے ہیں اور وہ آگے جا کر وزیر اعظم کا چناو کرتے ہیں۔ جمہوریت کی دو بنیادی خاصیتیں ہیں ایک لبرل جمہوریت اور دوسرا اسلامی جمہوریت۔ لبرل جمہوریت کے اندر خیر اور شر اضافی

اصطلاحات ہیں عوام جو چاہیں فیصلہ کریں، جبکہ اسلامی جمہوریت میں خیر اور شر اضافی نہیں قطعی اصطلاح ہے جس کو شریعت اچھا کہتی ہے وہ اچھا ہے اور جس کو شریعت برا سمجھتی ہے اس کو عوام اچھا نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح قانون سازی کے دو دائرے ہیں ایک شریعت کا جس کے لئے ضروری ہے کہ شریعت کے ماہرین ہی فیصلہ کریں البتہ دوسرا دائرہ مبارکات یا انتظامات کا ہے جس کے لئے مفہوم کو اختیار حاصل ہے۔ اسلام میں استبدال حکومت کے لئے اگر کوئی بغاوت کر دے تو چہ جائیکہ وہ پورا کنٹرول نہ سنjal لئے وہ باغی ہی تصور ہو گا لیکن جب اس نے پورا کنٹرول سنjal لیا تو پھر اس کے احکامات کی بجا آوری واجب ہے جیسے مارشل لاء ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ حکومت ہمارے حقوق پورے نہیں کر رہی اس لئے ہم اس کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ اسلام تو اس بات کی اجازت نہیں دیتا بلکہ صبر کی تلقین کرتا ہے اور اپنے اپنے فرانس کی ادائیگی پر زور دیتا ہے۔

مولانا محمد شفیع چترالی

کالم نگار روز نامہ اسلام کراچی

یہ موضوع گزشتہ ایک سو سال سے زیر بحث ہے مگر گیارہ تبراہ کے بعد یہ سوالات زیاد شدت کے ساتھ اٹھائے گئے ہیں۔ جب ہم اسلام اور جمہوریت کے تعلق کی بات کرتے ہیں تو دو اہتمائی درجے کی آراء سامنے آتی ہیں، ایک یہ کہ جمہوریت کفر ہے اور اسلام کا جمہوریت سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ لبرل ڈیموکریٹی کو ہمیں قبول کر لینا چاہئے اور اسلامی تعلیمات کی توحیح اسی کی روشنی میں کرنی چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں اہتماؤں کے بیچ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام اور جمہوریت دونوں کے بنیادی تصورات ایک جیسے ہیں اور دونوں ہی اجتماعی دانش کو پیش نظر رکھتے ہیں تو بے جانہ ہو گا۔ کلیسا اور مغربی معاشرے کے درمیان جو تناول رہا اس کے بعد مغربی مفکرین نے جو سیاسی نظام وضع کیا اس کی بنیاد انسانی حقوق تھے جن پر جمہوریت کی بنیادیں استوار ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسا تناول اسلام اور معاشرے کے درمیان بھی ہے اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ صبح 1920 میں ایک بڑا مہمی طبقہ تصادم اور مغرب سے بغاوت کی بات

کرتا تھا لیکن تحریک ریشی رومال کے بعد سب مذہبی حلقوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ وہ دستوری اور پر امن جدوجہد کریں گے۔ اسی کی بدولت پاکستان کے آئین میں قرارداد مقاصد اور اسلامی دفعات شامل ہوئیں جن کے لئے اس وقت کے جید علماء کا انتہائی اہم کردار تھا۔ اب اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ جمہوریت اور آئین کفر ہے تو وہ دراصل اس ساری جدوجہد پر نظر تنفس کھینچتا ہے۔ پاکستان کا آئین اسلامی ہے یہ بات فکری اور نظری اعتبار سے طے ہے مگر عملی طور پر صورتحال دوسری ہے۔ جب ہم ایک عام آدمی کو کہتے ہیں کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہے اور یہ ایک اسلامی ریاست ہے تو وہ سوچتا ہے کہ اسلام تو انصاف کی بات کرتا ہے کیا ہمارے ہاں انصاف ہے؟ اسلام حقوق کی بات کرتا ہے کیا یہاں وہ حقوق سب کو حاصل ہیں؟ اسلام ایک ایسی حکومت کی بات کرتا ہے جو اسلام کی شان و شوکت اور غلبے کی بات کرے لیکن ہمارے حکمران اور ریاست کسی بھی معاملے میں ہماری ترجیحی نہیں کرتے۔ چنانچہ لوگ اس سے تنفس ہو رہے ہیں۔ مصر میں دیکھ لیں وہاں اخوان المسلمین کی حکومت جمہوری جدوجہد کے بعد بر سر اقتدار آئی مگر ایک سال کے بعد ہی اس کو رخصت کر دیا گیا۔ حساس کی اسلامی حکومت کو بھی قبول نہیں کیا گیا۔ آج داعش جیسی تنظیموں کے پیچھے یہی فکر کار فرمایا ہے۔ کیونکہ مغرب کو جمہوریت کے ذریعے بھی اسلام پسند قابل قبول نہیں ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ سوال یہ نہیں کہ اسلام کو جمہوریت سے کوئی مسئلہ ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جمہوریت کو اسلام سے مسئلہ ہے۔

خورشید احمد ندیم: صاحب صدر

پڑتا لی صاحب کی گفتگو سے ایک اہم نقطہ سامنے آیا ہے کہ کیا جمہوری ہونے کے لئے سیکولر ہونا بھی ضروری ہے؟ یہ سوال ہمارے موجودہ تناظر میں بہت اہمیت اختیار کر چکا ہے اگر اگلے مقررین اس پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں۔

مولانا عبدالحق ہاشمی

مذہبی سکالر و ممبر ایڈ والائزری کو نسل جماعتِ اسلامی کو نہیں
جمہوریت اگر اکثریت رائے کو جانچنے کا کوئی طریقہ ہے تو اس میں کوئی عقلی اور شرعی

قباحت ہمیں نظر نہیں آتی۔ کیونکہ جمہوریت کی اصطلاح مغرب سے پہلے مسلمانوں کے ہاں راجح تھی۔ جب ہمارے فقہاء، مذاہب کے اختلاف کے سلسلے میں اپنی آراء کا اظہار کرتے تو اس میں ایک رائے جمہور کی بیان کی جاتی جس میں کلی نہیں بلکہ اکثریت مقصود ہوتی۔ اگر ہم فقہی مسائل میں جمہور کی رائے کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور علمی مباحثت میں اس کا ذکر فخر کے ساتھ کرتے ہیں تو پھر سیاسی مباحثت میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے۔ ایک دلیل ہمیں رسول اللہ کی زندگی سے یہ ملتی ہے کہ اگر ہم کسی نئی چیز کو قبول کریں تو وہ اصلاحی ہو گلی نہ ہو۔ مثال کے طور پر غالباً عرب میں ایک قدیم رسم تھی جس کو یکسر ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ رسول اللہ نے اس کو راجح رکھا مگر ایسے اصول و ضوابط دے دیئے کہ آہستہ آہستہ وہ خود ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ گویا حکیمیت مسلمان ہمیں کوئی امر مانع نہیں کہ ہم جمہوری نظام کے اندر تبدیلیاں لا کر اس کو اپنے معاشرے اور نظام کے مطابق ڈھال لیں۔ پاکستان کے آئین میں قرارداد مقاصد بھی ہے اسلامی شفیقین بھی ہیں، اسلامی نظریاتی کو نسل بھی ہے مگر ان میں سے کوئی بھی چیز پر یکیش میں نہیں ہے۔ جن معاشروں میں افراد کے حقوق کی پاسداری ہو رہی ہے وہاں نہ کوئی داعش ہے نہ طالبان، نہ القائدہ اور بوکوحرام، یہ صرف ان معاشروں کا کھیل ہے جہاں جابرانہ تسلط کے ذریعے لوگوں کو محرومی کی جانب دھکیلا گیا ہے۔

مفتش محمد زاہد وائس پرنسپل جامعہ امدادیہ فیصل آباد

ایک سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ جمہوری سسٹم اس تبدیلی کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ 1973 کا آئین ایک عہد ہے جس کی پاسداری ہم سب پر اخلاقی اور مذہبی طور پر عائد ہوتی ہے۔ اگرچہ آئین نہیں کہتا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ حرف آخر ہے بلکہ دستور خود تبدیلی کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔ آج تک ہمارے دستور میں اٹھارہ ترا میم ہو چکی ہیں۔ اٹھارویں ترمیم گویا آئین کی ایک بالکل نئی شکل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جیسا دستور ہم آج دیکھ رہے ہیں اگلے بیس سالوں میں اس کی کوئی اور ہی شکل ہو جائے۔ کیونکہ آئین قرآن وحدیت نہیں ہے اور یہ آپ سے کہتا رہتا ہے کہ آپ اپنی ترجیحات اور ضروریات کے تحت اس کو تبدیل کرتے رہیں۔

آئین تبدیلی کو روکنا نہیں ہے بلکہ تبدیلی کی گنجائش پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر میرے ذہن میں آئین سے ہٹ کر کوئی رائے بن گئی ہے اور میں نے اپنے چند حادثی بھی بنانے ہیں تو میں مطالبہ کرتا ہوں کہ آئین کو میری خواہش پر بدل دیا جائے حالانکہ اس مقصد کے لئے جو دستوری طریقہ کار ہے اس کے مطابق ہی آئین میں ترمیم ہو سکتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں آئین کو جس طرح سوالیہ نشان بنا دیا گیا ہے اس کی ایک وجہ وہ ہم بیان نئے بھی ہیں جو یہاں لوگوں کے ذہنوں میں پل رہے ہیں یہاں ادارہ جاتی تحقیق کاررواج نہیں جوان ہم بیانیوں کا راستہ روک سکیں اگر اس سلسلے میں کوئی کام ہو تو بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر شاقب اکبر

ڈاکٹر یکشرا خوت اکیڈمی اسلام آباد

حدیث پاک کی آئینی حیثیت پر عالم اسلام اور پاکستان میں بہت کام ہوا ہے۔ اسلامی نظریاتی کوasl نے اجتہاد دین کے حوالے سے اہم کام ضرور کیا ہے لیکن پارلیمنٹ میں اس کو زیر بحث لانے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی نظریاتی کوasl کا حسن یہ ہے کہ اس میں تمام مکاتب فکر کی نمائندگی ہے۔ جو سفارشات مرتب کی گئی ہیں ان پر سب کا اتفاق ہے۔ یہاں خلافت کے احیاء کی بات کی گئی جو لاائق مبارک تو ہے مگر اسلام میں حکمران کے انتخاب پر کوئی اجتماعی لائحہ عمل نہیں ملتا بھر آئینی حکومت کے ارتقاء اور خلافت کے قیام میں فکر اور پایا جاتا ہے۔ آج کل آپ اکثر سنتے ہیں کہ قرآن و سنت کی موجودگی میں کسی آئین کی ضرورت نہیں ہے جس سے معاشرے میں غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ حالانکہ آئین کی ضرورت قرآن و سنت کے مطابق ہی ہے۔ جدید فہم نے جو سوالات اٹھائے ہیں اگر ان کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تب بھی عقل و خرد کو ترجیح دینے والوں کے سوالات کا جواب دینا ہمارے علمی و فکری اداروں کی ذمہ داری ہے نیز یہ بھی کہ اس سے قانون سازی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ پھر عالمی قوانین جن کی پاسداری ہماری حکومتیں کر رہی ہیں ان کے بارے میں ہمارے فقہاء کیا رائے رکھتے ہیں، کیا ہمیں ان کی پاسداری کرنی چاہئے؟ انسانوں کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی شریعت فہمی اور

قانون شریعت کے فہم پر نظر ثانی کے حوالے سے سوچیں کہ کیا اس پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔

مولانا عطاء اللہ شہاب

ممبر ناردن ایریا کونسل و رہنمای جمیعت علمائے اسلام گلگت

1947 سے پہلے جب قیامِ پاکستان کی تحریک چلائی گئی تو ہر طرف ایک ہی نعرہ تھا ”پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ، لیکن جب پاکستان بن گیا تو اس کے بعد فکری مغالطوں کا باقائدہ آغاز ہوا کہ جس نعرے کو ہم نے پاکستان کے بنیادی محرک کے طور پر پیش کیا اُس کی عملی تعبیر کیا ہو گی؟ جن مقندر قوتوں کی خواہشات قیامِ پاکستان سے بڑی ہوئی تھیں انہوں نے بھی دانستہ طور پر اس خلیج کو وسیع کیا تاکہ ان کے مفادات کو نقصان نہ پہنچے۔ اس لئے جب بھی بہاں نفاذِ اسلام کی بات کی جاتی یہ لوگ کہتے کون سا اسلام، دیوبندیوں کا بریلویوں کا یا شیعوں کا، پہلے آپس میں اتفاق کر لیں پھر فصلہ کر لیں گے۔ اس کے بعد 1952 میں تمام مکاتب فکر کے علماء علماء بشیر احمد عثمانی کی قیادت میں اکٹھے ہوئے اور 22 نکات پر متفق ہوئے۔ آئین پاکستان میں بہت سی باتیں طے کر دی گئیں مگر ان کا عملی پہلو کہیں پر نظر نہیں آتا۔ خود آئین پاکستان کو روزانہ ڈی چوک میں چینچ کیا جاتا ہے۔ قوم میں روز بروز اہم بڑھ رہا ہے اس طرح کے فکری مکالموں سے قوم کو کوئی راہ مل سکتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔

مولانا عمار خان ناصر

ڈپٹی ڈائریکٹر الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ

نفاذِ اسلام کے لئے کون سا طریقہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہے؟ کیا وہ طریقہ جو پاکستان کی صفت اول کی مذہبی سیاسی جماعتوں نے اختیار کیا ہوا ہے یا پچھلے کچھ عرصے سے اس راستے کو ناکام سمجھتے ہوئے کچھ گروہوں نے ایک متبادل راستہ تجویز کیا ہے۔ ہمیں ان لوگوں کی جانب سے اٹھائے گئے سوالات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، عسکری جدوجہد پر یقین رکھنے والوں کا اصل مسئلہ اختیارات کی تقسیم، انتخابات کا طریقہ یا عوام کی رائے کی اہمیت کا نہیں بلکہ وہ اس سارے نظام کو اس لئے قبول کرنے کو تیار نہیں کیونکہ یہ سسٹم ان کے ہدف میں رکاوٹ ہے۔

ہماری فکر اور تہذیبی روایات ریاست سے داخلی اور خارجی سطح پر جس شان و شوکت کا تقاضا کرتی ہیں اس کا پس منظر اسلام کا وہ دور ہے جس میں وہ اپنے عروج پر تھا۔ یہ لوگ ریاست سے ویسی ہی شان کی بھالی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طبقے کے ساتھ ہمیں براہ راست مکالمہ کر کے اس کے سوالوں کا جواب دینا چاہئے۔ میرے خیال میں وہ سوالات درج ذیل ہیں:

- 1-- دنیا میں کسی بھی قوم کے تہذیبی و سیاسی غلبے کے لئے سنتِ الٰہی کیا ہے؟ کیا تہذیبی و سیاسی غلبے حق کے ساتھ مشروط ہے، کیا اللہ کا قانون ہے کہ وہ دنیا میں اسی قوم کو غلبہ دیتا ہے جو حق پر کھڑی ہو یا یہ کہ اس غلبے کے لئے اصول و ضوابط مختلف ہیں؟
- 2-- دنیا میں سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی غلبے کا کتنا تعلق انسان کی تقدیر سے ہے اور کتنا تکوینیات سے ہے؟ کیا محض تدبیری کوشش سے کچھ چیزیں حاصل کی جاسکتی ہیں یا یہ کہ خدا بھی تکوینی سطح پر کچھ فیصلے کر رہا ہوتا ہے؟ پھر یہ کہ اگر تکوینی سطح پر کوئی فیصلہ ہوا ہے تو کیا ہم محض تدبیری کوششوں سے اس کے خلاف تبدیلی لاسکتے ہیں؟
- 3-- اگر کسی قوم یا ملت کو صدیوں عروج حاصل رہا اور صدیوں کے عمل سے وہ زوال کا شکار ہوئی تو کیا صدیوں کے زوال کو ختم کرنے کے لئے کوئی مختصر المدتی حکمت عملی کا گرہوںتی ہے؟
- 4-- جہاد کے بارے میں قرآن و حدیث میں بہت سی چیزیں ملتی ہیں، بعض جگہ پر کہا گیا کہ اس امت کی کامیابی جہاد سے مشروط ہے، کیا اس کو ہم کچھ اور شرائط کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں یا یہ کہ ہم صرف جہاد سے ہی وہ تیجہ حاصل کر سکتے ہیں جو ہمیں اسلامی تاریخ کے شروع میں حاصل ہوا تھا۔
- 5-- جہاد کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کیا شریعت نے ہمیں اور بھی اصول دیئے ہیں، اس میں نفع و نقصان اور کامیابی کے امکانات کو کتنا وزن دینا چاہئے؟ تو ازن اور طاقت کے بارے میں ہمارا دین، شریعت یا فقہی اصول کیا رہنمائی دیتے ہیں؟
- 6-- کیا مغرب کا عروج محض طاقت، دولت اور اسلحے کے زور پر دنیا میں قائم ہوا ہے یا اس کی بنیاد سیاسی اور فکری ہے؟
- 7-- جب ہم امت کی سطح پر مسلمانوں کے تہذیبی غلبے کا خواب دیکھتے ہیں۔ آج یا امت داخلی

سطح پر جس صورتحال سے دوچار ہے اس کو موضوع بنائے بغیر اور کوئی ٹھوں حل تجویز کئے بغیر ہم تو قر کر سکتے ہیں کہ ہم دنیا میں مغربی تہذیب کی جگہ لے سکیں گے؟

8۔۔ اسلام مخصوص پوچاپاٹ کا مذہب نہیں ہے وہ ایک تہذیب ہے جو دنیا پر دوبارہ غلبے کا خواب دیکھتی ہے۔ کیا اسلام کے غلبے کی وہ صورت ممکن ہے جو ہمارے ذہنوں میں میں ہے؟ اس سلسلے میں ہمیں بعض مثالیں تاریخ سے بھی ملتی ہیں کہ اگر اللہ کو دنیا میں دوبارہ غلبہ اسلام کرنا ہے تو کیا وہ ایسا نہیں کر سکتا کہ تاتاریوں کی طرح کسی اور قوم کو یہ منصب سونپ دے اور کسی اور سے یہ کام لے لے۔

9۔۔ جمہوریت اور اسلام کے حوالے سے جو بحث ہو رہی ہے اس میں ایک بنیادی نظر یہ ہے کہ اسلام کے اساسی تصورات میں اور تاریخ میں مسلمانوں نے اس کو کیسے برداشت ہے۔ کیا یہ ساری چیزیں ہم معنی ہیں کہ جو اسلام ہے وہ مسلم تاریخ بھی ہے یا یہ ساری ایک ہی چیزیں ہیں، یا ان میں فرق کرنے کی ضرورت ہے؟

10۔۔ امت کے لئے راہ عمل متعین کرنا کس کا حق ہے؟ رائے کی آزادی تو سب کو ہے لیکن با فعل امت کی طرف سے لائج عمل طے کر کے اور اس پر عمل شروع کر دینا اور باقی امت سے یہ تو قر رکھنا کہ وہ ان کی پیروی کریں اور جو نہ کرے وہ نہ صرف غیر معیاری مسلمان ہے بلکہ اس کے خلاف فتوے بھی صادر کر دئے جاتے ہیں؟

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے اگلے مکالموں میں ان سوالات پر توجہ دینے اور اس طبقے کو براہ راست شریک کرنے کی ضرورت ہے اگر وہ شریک نہ بھی ہو تو امت خود اجتماعی طور پر یہ طے کر کے ایک اجتماعی لائج عمل دے تاکہ فکری سطح پر اس منصصہ کا خاتمه ہو سکے۔

صدر اتنی خطبہ

خورشید احمد ندیم

ندبی سکالر، کالم نگار ایکٹر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد
ہمیں ایک بنیادی سوال کا احاطہ کرنا پڑے گا کہ ریاست کی ضرورت کیوں ہے؟ کیا یہ

اسلام کے غلبے کے لئے ہے یا ریاست کا ادارہ کچھ اور ضروریات کی تکمیل کے لئے ہے۔ اس سوال کے ضمن میں کئی سوال جنم لیتے ہیں اگر ریاست بنا اسلام کا مقصود ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے خدوخال منصوص ہیں تو اس سے یہ مقدمہ ثابت ہوتا ہے کہ جو ریاست اسلام کے ماننے والے بنائیں گے وہ ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہوگی اور خاص نظریے کی ترتیج و اشاعت اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہوں گے۔ تو پھر بلاشبہ یہ ریاست اس ریاست سے قطعی مختلف ہے جو ریاست آج ارتقائی مراحل طے کر کے وجود میں آئی ہے، جس کو ہم قومی یا سیکولر ریاست کہتے ہیں۔ جس کے اہداف میں لوگوں کی معیشت، سیاست اور سماج کو منظم کر کے سب کو ایک نظام کے تابع بنانا ہوتا ہے۔ یہ ریاست انسانوں کے ان بنیادی حقوق، جن کا تعین وقت کے ارتقاء نے کیا ہوتا ہے ان کو یقینی بناتی ہے۔ جبکہ ہم اسلامی ریاست کے اہداف کو مقاصد شریعت کے تحت بیان کرتے ہیں۔ جدید ریاست کسی نظریے کو بنیاد بنا کر عالمی سطح پر ایک مورچہ قائم کرنے کی نفی کرتی ہے، کیونکہ وہ کوئی نظریہ نہیں رکھتی، اس کے شہریوں کا نظریہ ہو سکتا ہے، جدید ریاست ایک متعین دائرے کے اندر اس کی ترتیج و اشاعت کی صفات دیتی ہے۔ جبکہ مسلمان جو ریاست بنائیں گے اس کے مقاصد کو مولا نا مودودی نے بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا ہے جس کو فریضہ اقامتِ دین یا غلبہِ دین کہتے ہیں ان کے بقول اسلام کے پانچ نہیں چھ فرائض ہیں اور چھٹا فریضہ اقامتِ دین ہے۔ لہذا جب اسلامی ریاست بنے گی تو وہ غلبہِ دین کے لئے بنے گی۔ اب اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ریاست کے اندر جو اس نظریے کو نہیں مانتے وہ اس کے شہری تو بن سکتے ہیں لیکن کیا انھیں ریاست کے کلیدی عہدوں پر فائز کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ یہاں سے غیر مسلموں کے حقوق کا تصور پیدا ہوتا ہے کہ کیا انھیں بنیادی شہری حقوق میں برابر کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔ مولا نا مودودی اور مولا نا امین اصلاحی وغیرہ نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ مسلمانوں کو اصل منسلہ یہ درپیش ہے کہ جس نمونے کے اندر انھیں اپنے نقطہ نظر کو فروغ دینا تھا وہ قومی ریاست کا نمونہ تھا۔ پاکستان کی ریاست جن حالات میں بنی اس کو نظریاتی ریاست کہتے ہیں اب اس میں دین کا غلبہ قائم کرنے کی تحریک ہمارے دستیں میں قرارداد مقاصد سے لے کر 1973 تک نظر آتی ہے۔ آپ نے طے کر دیا کہ سربراہِ مملکت مسلمان کے علاوہ اور کوئی نہیں بن سکتا جس پر اقلیتوں نے ایسے

سوالات اٹھائے جو قومی ریاست کے ناظر میں تھے مگر انھیں اسلامی ریاست کے ناظر میں دیکھا جانے لگا۔ بعد میں جیسے جیسے حالات تبدیل ہوتے گئے بجائے اس کے کہ آپ آگے بڑھ کر کوئی نقطہ نظر اختیار کرتے، حالات کی تبدیلی کے تحت آپ اپنے آپ کو تبدیل کرتے چلے گئے۔ مثلاً ووٹ کا حق کہ مسلمان اپنے نمائندوں کا انتخاب اور غیر مسلم اپنے نمائندوں کا انتخاب کریں گے۔ لیکن بعد میں جب اس پر بحث ہوئی تو آپ جدا گانہ کی بجائے مشترکہ انتخاب پر راضی ہو گئے اور غیر مسلموں کو بھی اسی طرح ووٹ کا حق مل گیا جیسا کہ مسلمانوں کو حاصل تھا۔ جب آپ نے یہ حق تسلیم کر لیا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سیاسی جماعتیں امیدواروں کے چنان میں امتیاز بر تیں۔ آئین کے تحت جو ووٹ دے سکتا ہے وہ امیدوار بھی بن سکتا ہے۔ مشترکہ ووٹ کے تحت آپ کسی غیر مسلم کارست نہیں روک سکتے کہ وہ مسلم حلقوں سے کھڑا ہو۔

ایک اور اہم سوال کہ شریعت کے تحت جو کوئی اپنے آپ کو کسی عہدے کے لئے پیش کرتا ہے وہ از خود نا اہل ہو جاتا ہے۔ یہ سوال ہمارے ہاں بھی پچاہ کی دہائی میں جماعت اسلامی کو درپیش رہا۔ جب جماعت کے اندر یہ بحث اٹھی تو اس کے لئے ایک پیچیدہ طریقہ کا اختیار کیا گیا۔ پہلے ایک گروپ بنے گا وہ کسی کو نامزد کرے گا کہ یہ فردوٹ لینے کا اہل ہے۔ جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی نے مولانا امین اصلاحی اور مولانا اسماعیل سلفی کو انتخابات میں کھڑا کیا اور تو قعات کے عین مطابق دونوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ مولانا مودودی کہا کرتے تھے کہ جماعت کے اندر جو قرآن کا سب سے بڑا علم تھا اس کو ہم نے کھڑا کیا اور جو حدیث کا سب سے بڑا علم تھا اس کو بھی کھڑا کیا مگر دونوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ اور ضبط کیسے نہ ہوتیں مولانا امین اصلاحی جب انتخابی جلسوں میں تقریر پر شروع کرتے تو کہتے کہ دنیا میں اس سے بدترین آدمی کوئی نہیں ہے جو اپنے آپ کو کسی عہدے کے لئے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں جوانجام ہونا تھا وہ ہوا۔ پھر جماعت اسلامی ارتقائی مرافق سے گذری اور اب وہ بھی انتخابی طریقہ کا رکاوی طرح قبول کرتی ہے جس طرح پیپلز پارٹی اور دیگر جماعتیں کرتی ہیں۔ اگر اس سارے ارتقا کو سامنے رکھیں تو قومی ریاست کے جو تقاضے تھے مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو تدریجی اختیار کرتے چلے گئے۔ ان سب کے بارے میں اگر آپ ان سے علمی یا فقہی مباحث کریں گے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس کا کوئی

جواز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تصویری سے لے کر عورت کے سیاسی کردار تک ایک طویل فہرست ہے۔ علماء سے اگر ان کی رائے پوچھیں تو وہ اور ہے اگر ان کا طرزِ عمل دیکھیں تو وہ مختلف ہے۔ انہوں نے بالجرب ہی سہی ان سب کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے بعد یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ریاست کے بنیادی تصور پر نظر ثانی کر لی ہے اور جو دوسرے لوگ اس نتیجے پر پہنچ ہیں کہ ریاست کو کوئی نظر نہیں ہوتا ان کی پیروی کر رہے ہیں۔ یہ وہ بنیادی تضادات ہیں جو اس وقت ہمیں درپیش ہیں۔ ہم سوچتے تو ایک نظریاتی ریاست میں ہیں لیکن عملًا قومی ریاست کے نمونے میں حرکت پر یہ ہیں۔ آپ یہ قوانین لیتے ہیں کہ پارلیمنٹ قانون سازی کا حق رکھتی ہے لیکن جب وہ خواتین کے حقوق کے لئے کوئی قانون بناتی ہے تو آپ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ حالانکہ آئین کے تحت آپ اس کے خلاف آواز تو اٹھا سکتے ہیں لیکن پارلیمنٹ کے حق کو سلب نہیں کر سکتے۔ آپ کے علم میں ہے کہ مشرف دور میں حقوق نسوان بل لا یا گیا تو دینی حلقة اس کے خلاف کھڑے ہو گئے، مشرف جیسے آدمی نے بھی پسپائی اختیار کی اور پھر متبادل طور پر کچھ علماء کی چھتری تلے یہ قانون بنادیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علماء ساری بات کو سمجھتے ہوئے بھی شعوری طور پر اس احساس میں زندہ ہیں کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کا حق صرف علماء کو حاصل ہے اور یہ حق ان لوگوں کو نہیں دیا جا سکتا جو دین کو نہ ہی اس کے بنیادی امور کو سمجھتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ساری چیزیں جب تک وسعتِ قلمی کے ساتھ قبل توجہ قرار نہیں پائیں گی مسئلے حل نہیں ہوں گے۔ داخلی جرکے ساتھ آپ کو ایک عالمی جر بھی درپیش ہے اور بہت سی ایسی چیزیں جن کی گنجائش فہمیں دین میں نہیں ہے مگر آپ ان کو قبول کرتے جا رہے ہیں۔ مثلاً سزاۓ موت کا معاملہ ہے۔ دین، قصاص کا قطعی اصول بتاتا ہے لیکن دنیا یہ کہتی ہے کہ جو ملک ایسا کرے گا اسے اقتصادی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جس کی وجہ سے گزشتہ کئی سالوں سے سزاۓ موت پر عمل درآمد معطل ہے۔ یعنی آپ نے قانون تو نہیں بدلا مگر اس کا نفاذ ختم کر دیا۔ اگر ریاست نظریاتی ہے تو اسے اس قسم کے میں الاقوامی مسائل پر کیا کرنا چاہئے، ان سوالات پر بھی بحث ہونی چاہئے۔ جمہوری ریاست کے نمونے میں پارلیمنٹ سے باہر دھرنوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن جب آپ اسلام کی بات کرتے ہیں تو پھر وہاں اکثریت کوئی معنی نہیں رکھتی وہاں حق

کے تحت اٹھ کھڑا ہونا ہی اہم ہے جیسے خروج کی شرائط بیان کی جاتی ہیں۔ آپ ان دھرنوں کو خروج کے تناظر میں دیکھیں گے یا جدید جمہوری ریاست کے تناظر میں؟ علماء نے تو اس سلسلے میں علامہ اقبال کے اس اجتہاد کو بھی نہیں مانا جو وہ پارلیمنٹ کے بارے میں کرتے ہیں۔ اسی طرح حکمتِ عملی کا معاملہ ہے کہ اسلامی ریاست کی حکمتِ عملی کیا ہونی چاہئے؟ مولانا مودودی نے تو اس سلسلے میں ایک کتاب پچھی شائع کیا جس میں اسلامی ریاست کے قیام کے مراحل بیان کئے اور کہا کہ یہ منصوص ہے اور رسالتِ ماب کی سیرت سے ماخوذ ہے۔ پھر جماعت کا قیام بھی دین کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے۔ الجماعت کی جو روایتیں ہیں اس کا اطلاق بھی اس خاص جماعت پر ہونے لگتا ہے جو اقامتِ دین کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور اگر آپ اس جماعت میں شامل نہیں ہیں جو غلبہِ دین کے لئے جدوجہد کر رہی ہے تو آپ ایک بنیادی فریضے سے انحراف کر رہے ہیں۔

میں یہاں پر پیشیں گوئیوں کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا کیونکہ ہم جوانا دینی اور سیاسی نمونہ بناتے ہیں اس کے اندر ان کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً امام مہدی کا تصور ہے ہماری تاریخ میں کئی لوگ امام مہدی ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن کاندلوی نے ایک چھوٹا سا کتاب پچھلکھا ہے کہ ”مہدویت نے اسلام کو کیا دیا ہے؟“ انہوں نے ان سارے لوگوں کے حالات بیان کئے جنہوں نے مختلف ادوار میں امام مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور لوگوں سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کھڑے ہو جائیں۔ اہل تشیع حضرات تو مام المنشر کی دعا بھی مانگتے ہیں اگر امام مہدی کی دعا مانگنی ہے تو پھر دجال کے ظہور کی بھی دعا مانگنی پڑے گی۔ یہ سارے چیزیں دیکھنی پڑیں گی یہ کوئی کھیل تماشا نہیں ہے کہ کوئی آدمی اٹھ کر امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرے اور اگر امام مہدی کا ظہور واقع ہو جاتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میں الگ کھڑا رہوں اور میرا دین بھی محفوظ رہے۔ میرے لئے یہ بنیادی سوال ہے۔ پھر یہاں خلافتِ علیٰ منہاج النبوت کی بات ہوئی۔ ہمارے اہل علم میں سے بہت ساروں کی رائے ہے کہ اس حدیث کا مصدق حضرت عمر بن عبد العزیزؓ تھے۔ ان کا ظہور ہو گیا اور خلافتِ علیٰ منہاج النبوت قائم ہو گئی اب مزید کسی خلافت کا انتظار نہیں ہے۔ کیونکہ رسالتِ ماب کی بیشتر خود قرب قیامت میں ہوئی ہے اور آپ کی تشریف آوری کے بعد

سارے کاسارا دور قرب قیامت کا ہے۔ اگر یہ پیشین گوئی پوری ہو جگی تو پھر ڈاکٹر اسرار صاحب ہمیں جس چیز پر اکھڑا کرنا چاہ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اگر ان سوالات کے جواب نہیں آئیں گے تو ساری بحث نتیجہ خیر نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اطلاقی سوالات تو یقیناً اہمیت رکھتے ہیں لیکن اس سے زیادہ بنیادی سوالات اہمیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز صمدانی

جامعہ دارالعلوم کوئی کراچی

ہندوستان میں قومی ریاست کا تصور مولا نا محمد حسین مدینی نے آج سے ستر سال پہلے پیش کیا ان کا کہنا تھا کہ آج دنیا اُس طرف جا رہی ہے الہذا ہمیں ہندوستان کو ایک قومی ریاست کے طور پر قبول کر کے اس کے اندر رہنا چاہئے اور اپنے حقوق کا تحفظ کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے مقابلے پر اسلامی ریاست کے قیام کا نظر یہ ان لوگوں نے پیش کیا جو آس فورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے تھے۔ یہ ان کی رائے تھی کہ اسلام کے نام پر ایک ریاست بننی چاہئے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تقاضات کسی ایک طبقے کے نہیں بلکہ ہم نے اس ملک کی بنیاد جن چیزوں پر رکھی، ہو سکتا ہے کہ کچھ تقاضات وہاں سے چلے آرہے ہوں۔ اگر علماء کی بات اُس وقت مان لی جاتی تو شاید آج ہم اس مقام پر کھڑے نہ ہوتے۔

خورشید احمد ندیم:

پاکستان بناؤ دو قومی نظریے پر تھا لیکن آج یہ قوم مولا نا محمد حسین مدینی کے تصور پر ہے۔ اس لئے اب ہم پاکستانی قومیت کی بات کرتے ہیں جو پاکستان میں رہ رہے ہیں وہ ایک قوم ہیں۔ ہم قومیت کے لئے نظریے کو نہیں جغرافیہ کو اساس بنا رہے ہیں۔

متفقہ سفارشات

- کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہونے والے چار مباحثت میں علمائے کرام اور مذہبی سکالرز نے جن امور پر اتفاق کیا وہ درج ذیل ہیں۔
- ۱۔ اسلام کے سیاسی نظام میں حاکیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ مسلمان ریاست میں کوئی قانون شریعت کے خلاف نہیں بنایا جاسکتا۔ البتہ اجتہادی امور میں اجتماعی بصیرت اور غور و فکر سے قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مجلس قانون ساز کا تصور بنیادی طور پر اسلام کے خلاف نہیں ہے۔
 - ۲۔ اسلام کا سیاسی نظام شورائیت کے اصول پر مبنی ہے۔ مطلق العنان بادشاہی اور آمریت کا طرز حکومت اسلامی تصورات کے خلاف ہے۔
 - ۳۔ حکمرانوں کو رائے عامہ کا اعتماد حاصل ہونا چاہئے۔ تاہم حکمران کے انتخاب کا کوئی لگ بندھا ضابطہ شریعت میں نہیں بتایا گیا۔ خلافے راشدین کا انتخاب الگ الگ طریقوں سے کیا گیا۔ اس لیے بدلتے ہوئے حالات میں اس مقصد کے لیے کوئی بھی موزوں طریقہ کا اختیار کیا جاسکتا ہے۔
 - ۴۔ اسلام کی رو سے امیدوار کا انتخاب ایمان، عمل صالح، امانت و صلاحیت اور دیانت و امانت کی بنیاد پر ہونا چاہئے، جیسا کہ آئین پاکستان کی شق ۲۲ و ۲۳ میں بھی اس کی ضمانت دی گئی ہے۔ پاکستان میں نظام انتخابات کی اصلاح کے ضمن میں اقدامات و تجویز کو قومی سطح پر موضوع بحث بنایا جائے اور مردم بھر طریقہ کار کے ساتھ دیگر تبادل طریقہ ہائے کار مثلاً متناسب نمائندگی وغیرہ کو بھی زیر غور لایا جائے۔

- ۵۔ ریاستی سطح پر طے ہونے والے اجتماعی معاملات میں اختلافات و نزاعات کے تصفیے کے لیے اکثریت کی رائے کو بنیاد بنائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اقیست کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنے تصورات اکثریت پر مسلط کرے۔ یہی اصول شریعت کی تعبیر و تشریع کے باب میں بھی لا گو ہو گا اور اس کا فیصلہ منتخب پارلیمان کی سطح پر ہو گا۔
- ۶۔ اسلام اگرچہ مختلف سیاسی گروہوں کے وجود کی نفع نہیں کرتا لیکن وہ اس پر اصرار کرتا ہے کہ حکمرانوں پر تقیدیاں سے اختلاف کا متعدد نظام حکومت کی، بہتری، انسانی حقوق کا تحفظ اور رفلاح عامہ ہونی چاہئے۔ اسلام دھڑے بندی اور اختلاف برائے اختلاف کے بجائے باہمی تعاون اور خیر خواہانہ محاسبہ و تقید کو حکمرانوں اور رعایا کے باہمی تعلقات کی بنیاد تصور کرتا ہے۔
- ۷۔ پاکستان کا آئین ایک اسلامی آئین ہے جو علماء کی تائید سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں قرارداد مقاصد دیباپے کے طور پر موجود ہے، قوانین کو قرآن و سنت کے تابع رکھنے کی ضمانت دی گئی ہے اور خلاف شریعت قوانین کی تبدیلی کے لیے پورا طریق کا روضح کیا گیا ہے۔ اس کی حیثیت قومی اتفاق کی ہے جسے تمام نمائندہ طبقات کا اعتماد حاصل ہے۔
- ۸۔ آئین میں دی گئی ضمانتوں اور یقین دہانیوں کے باوجود ملک کے عملی نظام سے متعدد غیر اسلامی امور کا خاتمه نہیں کیا جاسکا۔ اس پہلو پر خاص توجہ دینی چاہئے، کیونکہ یہ آئین میں کیے گئے عہد کا بھی تقاضا ہے اور حکومتوں کی طرف سے عملی کوتاہی اور سماں کی وجہ سے فی نفسہ آئین اور دستور کے متعلق بھی متفق رہنات جنم لے رہے ہیں۔
- ۹۔ ملکی قوانین کی شریعت کی روشنی میں اصلاح کے لیے آئینی ادارے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو غور و خوض اور بحث کے لیے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ دستوری طور پر کونسل کی سفارشات کا پارلیمان کے سامنے پیش کیا جانا ضروری ہو۔
- ۱۰۔ دستور پاکستان کی حیثیت ایک قومی معاهدے کی ہے جس کی پاس داری اسلامی تعلیمات کی رو سے تمام فرقیوں پر ضروری ہے۔ البتہ دستور کی ہیئت میں کسی تبدیلی یا تبادل تباویز کے

حوالے سے بحث و مباحثہ کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے۔ نہ تو دستور کی کسی شق سے نظری اختلاف کو نداری قرار دینا چاہئے اور نہ عملی طور پر دستور سے ہٹ کر بزور قوت ملکی نظام میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بعض طبقات کی طرف سے اسلامی اقدار کے منافی غیر ذمدار انہ رویوں کی وجہ سے رد عمل پیدا ہوتا ہے جو بسا اوقات تشدد پر منجھ ہوتا ہے۔ اس روحانی کے سد باب کے لیے غیر اسلامی تصورات اور سرگرمیوں کی حوصلہ شنی کی جانی چاہئے اور ثابت اقدار کے فروع کے لیے ریاست کے ساتھ ساتھ ذرا رائع ابلاغ کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ ۱۱۔

مسلمان معاشروں میں جمہوریت کا وہی تصور قبل قبول ہو سکتا ہے جو اسلامی نظام اقدار اور ضابطہ حیات سے ہم آہنگ ہو۔ مغربی قوتوں کو چاہئے کہ وہ مسلمان معاشروں کی مذہبی و ثقافتی حاسیتوں اور ترجیحات کو پیش نظر کھیں اور معاشرت کی تشکیل یا انتقال اقتدار کے حوالے سے مسلم رائے عامہ کے اکثریتی و جمہوری فیصلوں کا احترام کریں۔ ۱۲۔

ایک نظریاتی اسلامی ریاست اور ایک قومی ریاست کی ترجیحات میں فرق کے حوالے سے پاکستان کے مختلف طبقات میں فکری ابہامات پائے جاتے ہیں جنھیں فکری سطح پر موضوع بنانے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں علمی تحقیقی اداروں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ ۱۳۔

نفاذ اسلام کے لیے غیر جمہوری اور عسکری جدوجہد پر یقین رکھنے والے طبقات کے ساتھ اسلام اور جمہوریت نیز جہاد اور غلبہ دین جیسے اساسی تصورات کے حوالے سے براہ راست مکالے کا اہتمام کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ اس ضمن میں موجود غلط فہمیوں اور ابہامات کا ازالہ کیا جاسکے۔ ۱۴۔

اسلام، جمہوریت اور آئینے پاکستان کی بحث نہیں ہے۔ تاہم عہدِ حاضر میں اس کا تناظر بدل گیا ہے۔ ایک طبقہ جمہوریت کو کفر قرار دیتا ہے تو دوسرا اسے شورائیت کے قریب تر گردانے ہوئے اس میں ایسی اصلاحات کا داعی ہے جو اسلامی اور قومی تقاضوں سے مطابقت رکھتی ہوں۔ پاکستان کا آئینہ اس ساری بحث میں کہاں پر کھڑا ہے، یہ سوال اس لئے بھی اہم ہے کہ آج جہاں اس پر عملداری چورا ہوں کام موضوع بن چکی ہے وہاں جمہوریت کے خلاف بات کرنے والوں نے اس کی اسلامی حیثیت بھی سوالیہ نشان بنا دی ہے۔ اسلام کا نظام حکومت کیا ہے اور وہ کس قسم کے معاشرے کا داعی ہے؟ اس سارے پس منظر میں سوچا جائے تو آپ کے سامنے سوالات کی ایک دنیا آکھڑی ہوتی ہے جس میں ہر مسلک اور کتبہ فکر کا اپنا اپنا جغرافیہ ہے۔ زیرِ نظر تصنیف اسی جغرافیے کے اندر ایک چہل قدمی ہے۔

اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان کی بحث نہیں ہے۔ تاہم عہد حاضر میں اس کا تناظر بدل گیا ہے۔ ایک طبقہ جمہوریت کو فرقہ اردیتا ہے تو دوسرا سے شورائیت کے قریب تر گردانٹے ہوئے اس میں ایسی اصلاحات کا داعی ہے جو اسلامی اور قومی تقاضوں سے مطابقت رکھتی ہوں۔ پاکستان کا آئین اس ساری بحث میں کہاں پر کھڑا ہے، یہ سوال اس لئے بھی اہم ہے کہ آج جہاں اس پر عملداری چورا ہوں کام موضوع بن چکی ہے وہاں جمہوریت کے خلاف بات کرنے والوں نے اس کی اسلامی حیثیت بھی سوالیہ نشان بنا دی ہے۔ اسلام کا نظام حکومت کیا ہے اور وہ کس قسم کے معاشرے کا داعی ہے؟ اس سارے پس منظر میں سوچا جائے تو آپ کے سامنے سوالات کی ایک دنیا آکھڑی ہوتی ہے جس میں ہر مسلک اور مکتبہ فکر کا اپنا اپنا جغرافیہ ہے۔ زیرِ نظر تصنیف اسی جغرافیہ کے اندر ایک چھل قدمی ہے۔

ISBN: 978-969-9370-20-5

9 789699 370205 >

Price: 100/-



پوسٹ بکس نمبر: 2110 اسلام آباد
فون: 051-2806074
فیکس: 051-8359474
ایمیل: pips@san-pips.com
ویب سائٹ: san-pips.com